غیر سودی بینکاری

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی خدمت میں

ہدیہ جواب

مفتی ڈاکٹر عبد الواحد

دار الافتاء جامعہ مدنیہ لاہور

دار الافتاء والتحقیق لاہور

مجلس نشریات اسلام

1-کے-3 ناظم آباد مینشن ناظم آباد نمبر 1

کراچی۔ پوسٹ کوڈ 74600

فہرست

شکوہ

بسم اللہ حامدا و مصلیا.

حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی محنت اور فکر سے پاکستان میں اسلامی بینکنگ کا عملی نظام جاری ہوا تو اس کی عملی تفصیل جاننے کا تجسس ہوا۔ جب مولانا مدظلہ کے صاحبزادے مولوی عمران اشرف عثمانی کی انگریزی میں کتاب Meezan Bank`s Guide To Islamic Banking بازار میں آئی تو اس کا مطالعہ کیا، مطالعہ پر اس میں جو چند واجب الاصلاح امور نظر آئے ان کو دلائل کے ساتھ تحریر کر کے مولوی عمران اشرف عثمانی کی خدمت میں بھیجا۔ کوئی جواب نہ پا کر اس مضمون کو ''اسلامی بینکاری کے چند واجب اصلاح امور'' کے نام سے ایک کتابچے کی صورت میں شائع کیا۔ شائع شدہ کتابچہ بھی دارالعلوم بھیجا گیا۔ دارالعلوم والوں نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی ان کی طرف سے افہام و تفہیم کی کوشش ہوئی۔ کوئی ڈیڑھ سال پہلے کمپنیوں کی محدود ذمہ داری پر اور تکافل پر لکھا اور ان کے غیر اسلامی اور غیر شرعی ہونے کو ثابت کیا۔ اس کی کاپی مولانا تقی عثمانی مدظلہ سمیت دارالعلوم کے بعض اور حضرات کو بھی بھیجی۔ بعد میں اسلامی بینکنگ، کمپنی اور تکافل سے متعلق اپنے مضامین کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے دیئے۔ اپنے ان مضامین میں ہم نے اس بات کا اہتمام کیا کہ جو بات بھی ہو دلیل اور ثبوت سے ہو۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم نے رائج کردہ اسلامی بینکنگ کو سو فیصد رد نہیں کیا جس کے مندرجہ ذیل دو ثبوت ہیں:

1- ہمارے کتابچہ کا نام ہی یہ تھا ''اسلامی بینکنگ کے چند واجب اصلاح امور'' اور اصلاح کی سوچ اسی وقت آتی ہے جب بنیادی نظام کا تحمل کیا جا سکتا ہو۔

2- اپنی کتاب ''جدید معاشی مسائل'' کے ص 133 پر ہم نے لکھا:

''جس کا (یعنی اسلامی بینکاری کا) یہ فائدہ تو ہے کہ جو لوگ پہلے سو فیصد سود میں ملوث تھے وہ اگر اپنے مالی معاملات اور بینکوں کو چھوڑ کر صرف اسلامی بینک سے کریں تو وہ مثلاً چالیس فیصد سود پر آجائیں گے۔''

پچھلے سال ابھی ہماری کتاب پبلشر کے پاس زیرِ طبع ہی تھی کہ کراچی کے ایک بزرگ عالم تشریف لائے اور بتایا کہ کراچی میں اسلامی بینکاری پر غور و فکر ہو رہا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب کی ایک کمپوز شدہ کاپی ان کو دی کہ اس کو بھی دیکھ لیں۔ ان کے بقول وہ حضرت مولانا سلیم اللہ خاں مدظلہ کے بھیجے ہوئے تھے۔ مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ کی جانب سے کوئی تین سال پہلے ایک سرکلر جاری ہوا تھا کہ اسلامی بینکنگ پر اجتماعی غور و فکر کا ارادہ ہے۔ جواب میں ہم نے لکھا تھا کہ اسلامی بینکنگ پر جو بھی اعتراض اٹھایا جائے وہ مضبوط ہو کمزور نہ ہو۔ بہرحال ان بزرگ کی مزید بات سے اندازہ ہوا کہ غور و فکر تو ہو چکا ہے اب فیصلہ کا اعلان کرنا باقی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے ہم سے ایک تحریر چاہی جس سے ہم نے معذرت کر لی۔ پھر ان حضرات کے فتوے کا اعلان ہوا۔ شروع میں ہمارا نام اس عنوان سے شامل ہوا کہ ہمارا مقالہ پڑھ کر سنایا گیا۔ وہ کونسا مقالہ تھا؟ ہمیں علم نہیں۔ بعد میں بعض حضرات نے ہمارا نام تائید کنندگان اور دستخط کنندگان میں شامل کر دیا جس سے ہمیں براءت کا اعلان ''انوار مدینہ'' میں چھپوانا پڑا کہ ہم نے نہ زبانی یا تحریری تائید کی اور نہ ہی کہیں دستخط کئے۔ شاید ان بعض حضرات کا یہ عمل اس بنیاد پر ہو کہ ہمارے مضامین سے اسلامی بینکنگ کی کچھ مخالفت نظر آتی ہے۔ ان حضرات کی جانب سے ان کے فتوے کی تائید میں ''مروجہ

اسلامی بینکاری'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی گئی۔

اصل تنازعہ تو ان دو جماعتوں کا تھا، یعنی مولانا تقی عثمانی مدظلہ اور ان کے موافقین کا اور مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ اور ان کے موافقین کا۔ لیکن مؤخر الذکر جماعت نے جب ہمارا نام استعمال کیا تو شاید ہم بھی اس جماعت میں شریک سمجھے جانے لگے۔

اگلے ڈیڑھ دو مہینے میں ہماری کتاب ''جدید معاشی مسائل اور مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے دلائل کا جائزہ'' بھی چھپ کر آ گئی جو ہم نے دارالعلوم سمیت بہت سے اداروں اور افراد کو بھیجی۔ اس بات نے ہمارے مخالف ہونے پر گویا مہر تصدیق ثبت کر دی۔

اب مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے ''غیر سودی بینکاری'' کے نام سے ایک نئی کتاب لکھی ہے جس میں جہاں دوسری جماعت کی باتوں کے جواب دیئے اور اپنی بات کے اثبات میں دلائل دیئے وہیں ہماری چند باتوں کے بھی جواب دیے اور اپنے حق میں دلائل دیئے۔ خیر اس ناپسندیدہ صورتحال میں ایک پسندیدہ بات یہ بن گئی کہ ہمیں اپنی بات پر مولانا مدظلہ کا مدلل تبصرہ اور جائزہ پڑھنے کو ملا۔

ہم نے الحمدللہ اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر مولانا مدظلہ کی بات درست ہوئی تو اس کو قبول کر لیں گے لیکن کتاب پڑھنے پر اندازہ ہوا کہ مولانا ہماری بات کا صحیح جواب نہ دے سکے۔ دوسروں کے بارے میں مولانا مدظلہ نے جو کچھ لکھا اس کو تو دوسرے جانیں ہمیں تو اپنی بات سے غرض ہے۔ اور جب بات صحیح اور غلط کی اور اس پر قائم کئے گئے دلائل کی ہے تو احقاق حق کی خاطر ہم ایک بار پھر قلم اٹھاتے ہیں۔ ہم مولانا مدظلہ کے دلائل کا جائزہ بھی لیں گے اور اپنے حق میں جو ممکنہ دلائل ہوں گے ان کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کریں گے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ احترام کا دامن

تھامے رکھیں لیکن دلائل پر نقد و تبصرہ کچھ آزادی کا تقاضا بہر حال کرتا ہے۔

مروجہ اسلامی بینکاری کے لئے نظام تکافل ضروری پشت پناہ ہے۔ اس کے غیر اسلامی ہونے پر ہم نے اپنی کتاب میں دلائل قائم کئے تھے لیکن مولانا مدظلہ نے اس پر کچھ کلام نہیں کیا۔ وجہ ہمیں معلوم نہیں۔ البتہ ان کے دارالعلوم کے مولانا ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی صاحب اور مولانا مفتی عصمت اللہ صاحب نے ہمارے مضمون پر کچھ تبصرہ لکھ کر بھیجا۔ اس میں جو اہم نکات نظر آئے ان کا جواب بھی ہم نے یہاں دیا ہے۔

ہمیں ڈر ہے کہ ہمارے اس شکوے سے بہت سے حضرات کبیدہ خاطر ہوں گے لیکن آخر اور ہو بھی کیا کہ ؎

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

عبدالواحد

دارالافتاء جامعہ مدنیہ راوی روڈ لاہور

دارالافتاء والتحقیق چوبرجی پارک لاہور

شعبان 1430ھ

اگست 2009ء

باب:1

وکالت کے تحت خریداری پر تحفظ اختیار کرنے کی ضرورت

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے دارالعلوم میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ نے 1992ء کے اجلاس میں مرابحہ مؤجلہ کے ذریعہ سرمایہ کاری کے تحت یہ تجویز دی تھی:

''مثلاً ایک کاشتکار بینک سے ٹریکٹر کی خریداری کے لئے قرض لینا چاہتا ہے تو بینک اس کو قرض دینے کے بجائے خود ٹریکٹر خرید کر بصورت مرابحہ مؤجلہ فروخت کردے گا۔

بینک کے لئے از خود تمام مطلوبہ اشیاء کی خریداری براہ راست مشکل ہے اس لئے وہ مطلوبہ اشیاء کی خریداری کے لئے خود عمیل کو اپنا وکیل بنادے گا اور یہ عمیل پہلے وہ چیز مثلاً ٹریکٹر بینک کے وکیل کی حیثیت سے خرید کر قبضہ میں لے لے گا اور خریداری کی تکمیل پر بینک کو مطلع کردے گا کہ میں نے وکالت کی بنیاد پر آپ کے لئے ٹریکٹر خرید کر اپنے قبضہ میں لے لیا ہے اور اب میں وہ ٹریکٹر آپ سے اپنے لئے خریدنا چاہتا ہوں''۔(احسن الفتاویٰ ج 7 ص119)

مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے اس پر حاشیہ لکھا:

''مجلس نے یہاں یہ اضافہ بھی کیا تھا جو غالباً سہواً تحریر سے رہ گیا ہے۔

بینک عمیل کے قبضہ کی تصدیق کے لئے اپنا کوئی نمائندہ بھیجے گا جو قبضہ ثابت ہونے پر اس کا سرٹیفکیٹ دے گا"۔(احسن الفتاویٰ ج7 ص119)

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی بینک اپنا نمائندہ بھیج کر قبضے کی تصدیق کروائے وہ ایسے کسی تحفظ کا تکلف اٹھانے کو تیار نہیں اور وہ اپنے عمیل کو کھلا موقع دیتا ہے۔خود عمران اشرف عثمانی صاحب اپنی کتاب میں اس تحفظ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"An agency agreement is signed by both parties in which the institution appoints the client as his agent for purchasing the commodity on its behalf.

The client purchases the commodity on behalf of the institution and takes possession as the agent of the institution. The client informs the institution that he has purchased the commodity and simultaneously makes an offer to purchase it from the institution." (Islamic Banking:p.127)

ترجمہ: دو پارٹیاں (یعنی بینک اور عمیل) ایک وکالت نامہ پر دستخط کرتی ہیں جس کے تحت بینک عمیل کو بینک کے لئے سودا خریدنے کی خاطر اپنا وکیل مقرر کرتا ہے۔عمیل بینک کے لئے وہ سامان خریدتا ہے اور بینک کے وکیل کے طور پر اس سامان پر قبضہ کرتا ہے۔پھر عمیل بینک کو اطلاع دیتا ہے کہ اس نے سامان خرید لیا ہے اور ساتھ ہی بینک سے اس کو خریدنے کی پیش کش بھی کرتا ہے۔"

اس پر مندرجہ ذیل عنوان کے تحت ہم نے اپنی کتاب میں لکھا

اسلامی بینک کا اپنے وکیلوں اور نمائندوں پر اندھا اعتماد

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں غلط بیانی کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ جعلی رسیدیں اور واؤچرز بنانا عام معمول کا حصہ ہے۔ ان حالات میں ایک اہم اور انقلابی نظام کو ایسے لوگوں کے سہارے پر چھوڑ دیا جائے تو اس نظام کی شکل بننے سے پہلے ہی بگڑنے کا قوی اندیشہ ہے جو قریب قریب یقین کے ہے۔ بلکہ موجودہ حالات میں تو بینک کے نمائندے کی تصدیق پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی شخص کی جیب میں پانچ سو یا ہزار کا نوٹ ڈالا جائے تو وہ دستخط کیوں نہ کرے یا کب تک نہ کرے؟ میزان بینک اور البرکہ بینک اور دیگر اسلامی بینکوں میں جس قسم کا عملہ موجود ہے وہ City Bank (سٹی بینک) یا Hong Kong Bank (ہانگ کانگ بینک) سے مختلف نہیں ہے۔ اس کی وضع قطع اور اس کی ہیئت سے ایسا کوئی تاثر نہیں ملتا کہ وہ کوئی مشنری (Missionary) جذبہ رکھتا ہے جب کہ انقلابی قسم کے کاموں کی کامیابی کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو انقلابی ذہن اور مشنری جذبہ رکھتے ہوں۔ محض Professionals سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور اگر بالفرض تصدیق کنندہ دیانتدار بھی ہو تب بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ عمیل نے سابقہ پڑا ہوا مال نہ دکھا دیا ہو یا کسی سے وقتی عاریت کے تحت لے کر نہ دکھا دیا ہو۔

مذکورہ بالا قوی خطرات کے ہوتے ہوئے موجودہ حالات میں اسلامی بینک کی اس عملی شق پر ظاہر ہے کہ اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔ (جدید معاشی مسائل ص: 154 تا 157)

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کا ردعمل

لیکن مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے ہماری اس بات کو دو طرح سے کمزور کرنے کی کوشش کی ہے:

1- مولانا مدظلہ نے مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کی بات پر بھی عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ لکھتے ہیں۔

’’دوسری بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ’’مجلس تحقیق مسائل حاضرہ‘‘ کا جو اجلاس سن 1992ء میں اس طریق کار پر غور کرنے کے لئے ہوا تھا، اس کی قرارداد میں اگرچہ یہ بات درج نہیں تھی، لیکن حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب مجلس کا یہ فیصلہ ’’احسن الفتاویٰ میں شائع فرمایا تو اس کے حاشیہ پر یہ نوٹ بھی لکھا کہ:

’’مجلس نے یہاں یہ اضافہ بھی کیا تھا جو غالباً سہواً تحریر سے رہ گیا ہے۔ بینک عمیل کے قبضے کی تصدیق کے لئے اپنا کوئی نمائندہ بھیجے گا جو قبضہ ثابت ہونے پر اس کا سرٹیفکیٹ دے گا۔‘‘ (احسن الفتاویٰ ج:7 ص:119)

حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم العالی نے بھی حضرت مفتی صاحب قدس سرہ، کی اس بات کی بنیاد پر یہ فرمایا ہے کہ چونکہ اس پر عمل نہیں ہو رہا، اس لئے ’’بینک کی اس عملی شق پر ظاہر ہے کہ اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

(جدید معاشی مسائل ص:157)

چونکہ اس مجلس کے انعقاد کو ایک عرصہ گزر چکا ہے، اور سوائے اس تحریر کے اس کا کوئی اور ریکارڈ بھی موجود نہیں ہے، اس لئے بہت ذمہ داری سے کچھ کہنا تو مشکل ہے، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے، بات یہ نہیں تھی کہ بینک کا کوئی نمائندہ قبضے کی تصدیق کرے، بلکہ یہ تھی کہ وہ جائے، اور خود خریداری کرے، یعنی توکیل کی ضرورت نہ ہو۔ اور یہ بات دوران گفتگو آئی ضرور، لیکن اسے چونکہ ایک لازمی شرط نہیں سمجھا گیا، بلکہ توکیل کی اجازت دی گئی، اس لئے تحریر میں نہیں آئی، اور جب تمام حضرات نے دستخط کئے تو کسی نے اس وقت اس پر اشکال نہیں کیا‘‘ (غیر سودی بینکاری ص211,210)۔

هم کہتے ہیں

مولانا عثمانی مدظلہ تو ذمہ داری سے کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن مولانا مفتی رشید احمد صاحب

رحمہ اللہ بھی تو غیر ذمہ دار آدمی نہ تھے۔ انہوں نے احسن الفتاویٰ میں اس بات کو شائع کیا تو ذمہ داری سے ہی شائع کیا ہوگا اور انہوں نے اجلاس کے بعد کچھ ہی عرصہ میں شائع کر دیا تھا۔ پھر ہمیں اب بھی اچھی طرح یاد ہے۔ ہم تو ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بات وہی ہے جو مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے لکھی ہے۔ دستخط کرتے وقت ہمیں توجہ نہ رہی تو یہ اور بات ہے۔

علاوہ ازیں احسن الفتاوی کی ساتویں جلد جس میں یہ بات مذکور ہے اس کو شائع ہوئے پندرہ سال گزر گئے ہیں اور وہ مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کی حیات میں ہی چھپ گئی تھی، مولانا عثمانی مدظلہ نے اتنے سالوں تک خاموشی کیوں اختیار کئے رکھی؟ احسن الفتاوی کی ساتویں جلد کا یہ اقتباس تو مولانا عثمانی مدظلہ یا ان کے دارالعلوم کے ساتھیوں میں سے کسی کی نظر میں تو یقیناً آیا ہوگا۔

2- مولانا عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

"لیکن اگر واقعی مجلس کی تحریر میں یہ لکھنا طے ہوا ہو، اور سہواً لکھنے سے رہ گیا ہو، تب بھی ظاہر ہے کہ معاملے کا جواز اس پر موقوف نہیں تھا، بلکہ اطمینان کے حصول کے لئے اس کو ذکر کرنا پیش نظر ہوگا۔ اور اگر یہ اطمینان کسی اور ذریعے سے حاصل ہو جائے، تب بھی مسئلے کی شرعی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اب اس اطمینان کو حاصل کرنے کے لئے غیر سودی بینکوں کے نگران اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ جہاں قبضے میں شبہ کی گنجائش ہو، وہاں وہ خود یا کسی نمائندے کو بھیج کر خریداری اور قبضے کا اطمینان کریں، کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ جس چیز پر مرابحہ ہو رہا ہے وہ نہ صرف بینک کی ملکیت میں آئے بلکہ وکیل کے واسطے سے اس کے قبضے اور ضمان میں بھی آئے، اور بعد میں وکیل اسے باقاعدہ ایجاب وقبول کے ذریعے بینک سے خریدے۔ ایسی صورت میں، میں نہیں سمجھتا کہ اس کے جواز میں کوئی اشکال ہوسکتا ہے۔" (غیر سودی

بینکاری ص 211,212)۔

ہم کہتے ہیں

مولانا عثمانی مدظلہ نے بات کو بھی بدلا اور بات کے رنگ کو بھی بدل دیا۔

(ا) بات کو اس طرح سے بدلا کہ اصل بات تھی قبضے میں شبہ اور عدم اطمینان کی لیکن مولانا اس کو معاملہ کے جواز کی طرف لے گئے اور شروع میں بھی یہ لکھا کہ "تب بھی ظاہر ہے کہ معاملے کا جواز اس پر موقوف نہیں تھا" اور آخر میں بھی لکھا کہ "ایسی صورت میں میں نہیں سمجھتا کہ اس کے جواز میں کوئی اشکال ہوسکتا ہے"۔ اور پھر آخر میں مفتی حمید اللہ جان صاحب مدظلہ کا جواز میں یہ فتویٰ نقل کر دیا:

"پھر اگر کوئی شخص یا ادارہ ایسا نہیں کر سکتا کہ پہلے وہ اس چیز کو بازار سے اپنے لئے خریدے اور قبضہ وملکیت کے بعد آگے ضرورتمند کو دیدے تو وہ ضرورتمند کے ساتھ ایک معاہدہ وکالت طے کرے، اس معاہدہ کے تحت وہ شخص اس ادارہ وغیرہ کا وکیل بن کر بازار سے اپنی مطلوبہ چیز اپنے مؤکل کے لئے خرید کر اس پر قبضہ کر لے، پھر اس سے اپنی ضرورت کے تحت نئے عقد کے ساتھ اپنے لئے خریدے۔ ایسا کرنا شرعا درست ہے۔"

(غیر سودی بینکاری ص 212)

اس طرح سے مولانا مدظلہ نے قاری کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہم عدم اطمینان کے نہیں عدم جواز کے قائل ہیں۔

(ب) اور بات کے رنگ کو دو طرح سے بدلا

i- ہم نے دستاویزی ثبوت سے بتایا تھا کہ بینک اپنے گاہک وکیل پر اندھا اعتماد کرتا ہے اور خطرات سے تحفظ کا کوئی تکلف نہیں کرتا۔

لیکن مولانا مدظلہ نے کسی دستاویزی ثبوت کے بغیر محض زبانی کلامی یہ تسلی دے دی کہ "اب اس اطمینان کو حاصل کرنے کے لئے غیر سودی بینکوں کے نگران

اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ جہاں قبضے میں شبہ کی گنجائش ہو وہاں وہ خود یا کسی نمائندے کو بھیج کر خریداری اور قبضے کا اطمینان کریں۔''

حالانکہ مولانا عثمانی مدظلہ کو چاہئے تھا کہ وہ اسلامی بینکوں کی پالیسی اور طریق کار کی دستاویزی حوالجات کے ساتھ تفصیل بتاتے کہ بینک تحفظ کی یہ یہ تدابیر اختیار کرتا ہے۔

ii- مولانا مدظلہ کوئی ثبوت فراہم کئے بغیر فرماتے ہیں:

''یہاں پہلی بات تو یہ واضح کرنا مناسب ہے کہ گاہک ہی کو وکیل بنانے کا طریق کار ہمیشہ اختیار نہیں کیا جاتا، بہت سی صورتوں میں بینک براہ راست خریداری کر کے گاہک کو بیچتا ہے، اور غیر سودی بینکوں کے شریعہ بورڈ بکثرت اپنے اپنے اداروں پر زور دیتے ہیں کہ وہ جہاں تک ہو سکے براہ راست خریداری کریں، گاہک کو وکیل نہ بنائیں۔ اور اب رفتہ رفتہ یہ رجحان پیدا بھی ہو رہا ہے۔ (غیر سودی بینکاری: ص210)

ہم کہتے ہیں

یہ بات سوچنے کی ہے کہ جب آپ نے بینک کو ایک مخصوص پالیسی دی ہے اور بینک کی دستاویزات اور اس کے فارم اسی پالیسی کے مطابق چھپے ہوئے ہیں اور عملہ کی تربیت اسی کے مطابق ہوئی ہے تو بینک کے نگران کس ضابطہ کے تحت بینک کی پالیسی سے تجاوز کر کے مذکورہ کارروائی کرتے ہیں؟

اور یہ مان بھی لیں کہ اب بینک اس بارے میں باشعور ہو گئے ہیں تو پچھلے کئی سال جو اس ادراک وشعور کے بغیر گزرے ان میں تو بہت سی خرابیاں سامنے آئی ہوں گی۔ آخر وہی خرابیاں ہی تو شعور کا باعث بنی ہوں گی۔ ہم نے تو اپنی بات بہت شروع میں رکھ دی تھی اور اپنا کتابچہ دار العلوم بھی بھجوایا تھا۔ نیز احسن الفتاوی کو چھپے ہوئے بھی ایک عرصہ دراز ہو گیا ہے اب مولانا کو چاہئے تھا کہ وہ پہلے کی تقصیر کو تسلیم کرتے اور آگے کی بات کو دستاویزی حوالوں سے ثابت کرتے لیکن مولانا مدظلہ نے ان میں سے کوئی بات بھی تو نہ کی۔

باب:2

یومیہ پیداوار کے طریقے پر ہمارا پہلا اعتراض

اور مولانا عثمانی مدظلہ کے جواب کا جائزہ

یومیہ پیداوار کا طریقہ کار

یومیہ پیداوار کا جومختصر بیان مولوی عمران اشرف عثمانی صاحب نے اپنی انگریزی کتاب Meezan Bank`s Guide to Islamic Banking میں کیا اس کا اردو میں ترجمہ یہ ہے جو ہم اپنی کتاب 'جدید معاشی مسائل سے نقل کرتے ہیں:

''بہت سے مالیاتی ادارے کسی کاروباری ادارے کے زیرگردش سرمایہ کو اس طریقے سے ترتیب دیتے ہیں کہ اس کا ایک رواں کھاتہ کھول دیتے ہیں جس میں سے عمیل مختلف اوقات میں مختلف رقمیں نکالتے ہیں اور ساتھ ہی فاضل سرمایہ جمع بھی کراتے رہتے ہیں۔ غرض رقمیں جمع کرانے اور نکالنے کا عمل تاریخ انتہا تک چلتا رہتا ہے اور یومیہ بنیادوں پر سود کا حساب لگایا جاتا ہے۔ کیا ایسا معاملہ مشارکہ اور مرابحہ کی سرمایہ کاری میں بھی کیا جا سکتا ہے۔؟''

اگر پارٹیوں کے درمیان ایسے معاملہ پر اتفاق ہو جائے تو اس سے مشارکہ کے کسی بنیادی ضابطہ کی مخالفت نہیں ہوتی۔ عملی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ پارٹیوں نے اس قاعدہ وضابطہ پر اتفاق کرلیا ہے کہ مشارکہ کے کھاتے

میں مدت کے آخر میں جو نفع جمع ہو وہ اس بنیاد پر تقسیم ہوگا کہ اوسطاً فی یوم کتنا سرمایہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے فی یوم فی روپیہ حاصل ہونے والا نفع معلوم ہوگا جس کو ان ایام کے عدد سے ضرب دیں گے جن میں ہر سرمایہ کار نے اپنا سرمایہ کاروبار میں لگایا ہے۔ اس سے یومیہ بنیادوں پر نفع کی تعیین کی جا سکے گی۔"

اس بیان کے بعد عمران اشرف صاحب نے پھر خود ہی ایک اعتراض وارد کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ شراکت میں تو شریکوں کے راس المال کا علم ہوتا ہے جب کہ اس نظام میں کھاتہ دار رقمیں نکالتے اور جمع کراتے رہتے ہیں اس لئے مشارکہ میں داخل ہوتے وقت ان کے سرمایہ کی مقدار مجہول ہوتی ہے اور اس جہالت سے مشارکہ باطل ہو جاتا ہے۔ پھر اس اعتراض کے جواب میں عمران اشرف صاحب علامہ کاسانی رحمہ اللہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ جہالت مفضی الی النزاع (جھگڑے کا باعث) نہیں ہے کیونکہ جب سامان خریدا جاتا ہے تو مقدار کا علم ہو ہی جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"لیکن مشارکہ کا مجوزہ رواں کھاتہ جس میں شریک روزانہ داخل اور خارج ہوتے رہتے ہیں کوئی بھی شریک اس میں متعین رقم جمع کرانے کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے۔ اس لئے مشارکہ شروع کرنے کے وقت ہر شریک کے راس المال (سرمایہ) کی مقدار نامعلوم ہے جس کی وجہ سے مشارکہ فاسد ہو جانا چاہئے۔

مذکورہ بالا اعتراض کا جواب یہ ہے کہ فقہ اسلامی کے قدیم محققین کا اس بارے میں اختلاف رائے ہے کہ مشارکہ کے جواز کے لئے آیا شرکاء کے راس المال کا پہلے سے معلوم ہونا شرط ہے یا نہیں۔ حنفی علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ شرط نہیں ہے۔ مشہور حنفی فقیہ علامہ کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ہمارے حنفیہ کے مطابق مشارکہ کے جواز کے لئے یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ راس المال کی مقدار معلوم ہو اگرچہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ شرط

ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جہالت بذات خود عقد کے لئے موجب فساد نہیں ہوتی بلکہ صرف اسی وقت ہوتی ہے جب وہ نزاع کا باعث بنے۔ اور مشارکہ کے شروع میں راس المال کے بارے میں جہالت نزاع کا باعث نہیں ہوتی کیونکہ (مشارکہ کے تحت) جب سامان خریدا جاتا ہے تو اس کا علم ہو جاتا ہے لہٰذا نفع کی تقسیم میں وہ جہالت کا باعث نہیں ہوتی۔''

(ص:140-143)

ہم کہتے ہیں

مولوی عمران اشرف عثمانی کی اس تحریر پر ہم نے اپنی کتاب جدید معاشی مسائل میں لکھا تھا کہ:

ہمیں افسوس ہے کہ علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی عبارت کا جو مطلب مولوی عمران اشرف صاحب نے بتایا ہے ہم اس سے اتفاق نہیں کر سکے۔ علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی عبارت یوں ہے:

ولنا ان الجهالة لا تمنع جواز العقد لعينها بل لافضائها الى المنازعة وجهالة راس المال وقت العقد لا تفضى الى المنازعة لانه يعلم مقداره ظاهرا و غالبا لان الدراهم والدنانير توزنان وقت الشراء فيعلم مقدارها فلا يؤدى الى جهالة مقدار الربح وقت القسمة. (بدائع الصنائع ج6 ص 63)

(ترجمہ: ہماری دلیل یہ ہے کہ جہالت بذات خود عقد کے جواز کے مانع نہیں ہوتی بلکہ مفضی الی المنازعہ ہونے کی وجہ سے مانع ہوتی ہے۔ اور عقد کے وقت راس المال کی مقدار کی جہالت مفضی الی المنازعہ نہیں کیونکہ عام طور سے سامان کی خرید کے وقت چونکہ دراہم ودنانیر کو تولا جاتا ہے اس لئے اس وقت اس کی مقدار معلوم ہو جاتی ہے لہٰذا نفع کی تقسیم کے وقت نفع کی مقدار بھی مجہول نہیں رہتی۔)

علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ عقد کے وقت سرمایہ کی مقدار کا تفصیلی علم ہونا

شرط نہیں۔ یہ کہنا کہ عقد کے وقت مقدار کا اجمالی علم بھی شرط نہیں ہے بلا دلیل ہے۔ دیکھئے علامہ رحمہ اللہ خود فرماتے ہیں کہ خریداری کے وقت چونکہ دراہم و دنانیر کا وزن کیا جاتا ہے تو اس وقت ان کی مقدار کا علم جو کہ تفصیلی علم ہے ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دراہم و دنانیر سے علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی مراد وہ دراہم و دنانیر ہیں جو عقد کے وقت سامنے رکھ دیئے گئے کہ ان کے ساتھ مشارکت ہوگی۔ غرض عقد کے وقت دراہم و دنانیر سامنے ہونے کی وجہ سے یا ان کی طرف اشارہ ہونے کی وجہ سے ان کی مقدار کا اجمالی علم تو ضرور ہوا جب کہ یومیہ بنیاد کے مسئلہ میں عقد کے وقت سرمایہ کی مقدار کا نہ تو اجمالی علم ہے اور نہ تفصیلی علم ہے۔

آخر شرکت عنان کی حقیقت یہی تو ہے کہ کم از کم دو فریق اپنے متعین سرمائے اس عقد میں متفق علیہ مدت تک کے لئے مخصوص کر لیں اور ان کی بنیاد پر (اور ضرورت ہو تو عمل کی وجہ سے بھی) اپنے لئے نفع کی شرح طے کریں۔ علامہ کاسانی رحمہ اللہ کے دور میں یومیہ بنیاد (Basis of daily products) کا تو وجود نہیں تھا لہٰذا کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ ان کے دور میں دو آدمی آپس میں مشارکت کا عقد تو کریں لیکن عقد کے وقت ان کو سرمایہ کی مقدار کا کچھ اندازہ نہ ہو۔ غرض علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی عبارت کو عمران اشرف صاحب اپنے حق میں لائیں یہ کسی طرح درست نہیں ہے۔ (ص:144,145)

ہمارے اس اعتراض کے جواب میں مولانا تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے اپنے مقالے میں عرض کیا ہے کہ اس طریقے پر یہ اعتراض بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں رأس المال کی مقدار مدت شرکت شروع ہونے کے وقت معلوم نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عقد شرکت کے وقت پورے رأس المال کا معلوم ہونا شرط نہیں ہے۔ بدائع میں ہے:
>
> ''و أما العلم بمقدار رأس المال وقت العقد فليس بشرط لجواز الشركة بالأموال عندنا.'' (ج 6 ص 63)

اس پر حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم نے یہ اشکال کیا ہے کہ صاحب بدائع نے ہی آگے یہ فرمایا ہے کہ جب کوئی چیز شرکت کے لئے خریدی جائے گی، اُس وقت دراہم ودنانیر وزن کر کے دیئے جائیں گے تو رأس المال معلوم ہو جائے گا۔(جدید معاشی مسائل ص 144)۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شرکت میں اکثر سارے رأس المال سے ایک دم چیزیں نہیں خریدی جاتیں، بلکہ وقفے وقفے سے خریدی جاتی ہیں۔ لہٰذا صاحب بدائع کا مطلب یہ ہے کہ پہلی خریداری کے وقت اتنا رأس المال معلوم ہو گیا جس سے خریداری کی گئی، مزید رأس المال اگلی خریداری پر معلوم ہو جائے گا، یہاں تک کہ جب نفع کی تقسیم کا وقت آئے گا تو اس وقت پورا رأس المال معلوم ہو چکا ہو گا، اور رأس المال کا معلوم ہونا اسی لئے ضروری ہے کہ نفع کی تقسیم اس پر موقوف ہے۔ چنانچہ علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ کی پوری عبارت یہ ہے:

”ولنا أن الجهالة لا تمنع جواز العقد لعينها بل لافضاء ها إلى المنازعة، وجهالة رأس المال وقت العقد لا تفضى إلى المنازعة، لأنه يُعلم مقداره ظاهرا و غالبا، لأن الدراهم والدنانير تو زنان وقت الشراء <u>فيعلم مقدار ها، فلا يؤ دى الى جهالة مقدار الربح وقت القسمة.</u>“

(بدائع الصنائع، كتاب الشركة ج 6 ص 63)

خط کشیدہ جملے سے صاف واضح ہے کہ پورے رأس المال کا معلوم ہونا نفع کی تقسیم کے وقت ضروری ہے، تاکہ اس کے مطابق طے شدہ شرح سے نفع تقسیم کیا جا سکے، اور جوں جوں کاروبار میں روپیہ لگتا رہے گا، رأس المال معلوم ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ تقسیم کے وقت سب کچھ واضح ہو چکا ہو گا۔ ورنہ اگر یہ شرط لگائی جائے کہ نفع کی تقسیم تک جتنا سرمایہ لگنا ہے، وہ سارے کا

سارا پہلے دن ہی معلوم ہونا چاہئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک مرتبہ سرمایہ لگانے کے بعد نفع کی تقسیم تک کسی بھی فریق کو مزید سرمایہ لگانے کی اجازت نہیں ہے، اور یہ بات بدیہی طور پر غلط ہے، لہٰذا جیسا کہ علامہ کاسانی رحمہ اللہ نے فرمایا، پورے سرمائے کا علم میں آنا درحقیقت تقسیم نفع کے لئے ضروری ہے۔ اور یومیہ پیداوار کے زیر بحث طریقے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ شروع میں رأس المال کی ایک مقدار معلوم ہوتی ہے، پھر جوں جوں لوگ اُس میں رقمیں ڈالتے جاتے ہیں، وہ رقمیں معلوم ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ نفع کے حساب کے وقت پوری صورت حال اس طرح واضح ہو چکی ہوتی ہے کہ کسی نزاع کا احتمال نہیں رہتا۔"

(غیر سودی بینکاری ص:324,325)

ہم کہتے ہیں

مولانا عثمانی مدظلہ کی اس بات میں مندرجہ ذیل خرابیاں ہیں۔

1-علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی عبارت کا مطلب غلط لیا

علامہ کاسانی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ "خریداری کے وقت دراہم و دنانیر کا وزن کیا جاتا ہے۔" اس بات پر قرینہ ہے کہ عقد کے وقت دراہم و دنانیر بے وزن کے موجود تھے۔ خریداری کے وقت ان کا وزن کرلیا گیا خواہ خریداری اور وزن ایک دفعہ میں ہو یا چند مواقع میں ہو۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی پوری عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"ہماری دلیل یہ ہے کہ جہالت بذات خود عقد کے جواز سے مانع نہیں ہوتی بلکہ تنازعہ کا باعث ہونے کی وجہ سے مانع ہوتی ہے۔ اور عقد کے وقت راس المال کی مقدار کا معلوم نہ ہونا تنازعہ کا باعث نہیں بنتا کیونکہ عام طور سے خریداری کے وقت دراہم و دنانیر کا وزن کیا جاتا ہے اور ان کی مقدار معلوم ہو جاتی ہے اور نفع کی تقسیم کے وقت نفع کی مقدار کی

جہالت کا باعث نہیں بنتی۔''

دیکھئے علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی اس عبارت میں مسئلہ راس المال کی مقدار کی تعیین کا ہے۔اس کی موجودگی وعدم موجودگی کا نہیں ہے۔مقدار کی جہالت اگرچہ عدم موجودگی سے بھی ہوتی ہے لیکن وہ ایک منطقی بات ہے۔عملی بات یہ ہے کہ راس المال موجود ہو کہ اس کی ڈھیری لگی ہو لیکن تفصیلی مقدار کے لئے وزن کی ضرورت ہو۔

ہم نے اب تک تو جو بات کہی تھی وہ پیش نظر عبارتوں کو سمجھ کر کہی تھی لیکن اب مجلّہ اور شرح مجلّہ کی ایک عبارت اس موضوع پر صریح مل گئی جو یہ ہے:

یشترط فی المضاربة کشرکة العقد کون راس المال معلوما و تعیین حصة العاقدین من الربح جزءً شائعا کالنصف. (مجله ماده 1411)

(ترجمہ: شرکت عقد کی طرح مضاربت میں بھی راس المال کا معلوم ہونا شرط ہے اور نفع میں عاقدین کے حصہ کا جز وشائع ہونا بھی شرط ہے۔)

شرح مجلّہ میں ہے:

والمراد بعلم راس المال علمه بتسمية مقداره او بالاشارة اليه كما اذا عقدا المضاربة على صرة دراهم اشار اليها و هما لا يعرفان مقدارها فانه يجوز. (ج4 ص 332)

(ترجمہ: راس المال کے معلوم ہونے سے مراد ہے کہ اس کی واقعی مقدار کو ذکر کیا گیا ہو یا اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو مثلاً دو آدمیوں نے مضاربت کا معاملہ کیا ہو اور دراہم ایک تھیلی میں ہوں جس کی طرف رب المال نے اشارہ کیا ہو اور دونوں میں سے کسی کو بھی ان دراہم کی واقعی مقدار معلوم نہ ہو تو یہ معاملہ جائز ہے۔)

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا شرط معاملہ کرنے کے وقت کی ہے نفع کی تقسیم کے وقت کی نہیں کیونکہ نفع کی تقسیم کے وقت تک تو سارا سرمایہ استعمال ہو کر معلوم ہو ہی جاتا ہے اور یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ دراہم بھری تھیلی کی طرف اشارہ کیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مضاربت اور شرکت کی ابتدا میں راس المال کا تفصیلی یا اجمالی علم

ہونا شرط ہے۔ **فللہ الحمد و المنۃ.**

2- شرکت میں نقصان کا ضابطہ ٹوٹتا ہے

دو آدمی شرکت عنان کا معاملہ کریں اور سرمایہ طے نہ کریں نہ اجمالی طور پر اور نہ تفصیلی طور پر۔ ان میں سے ایک دس ہزار کا سامان شرکت پر خریدتا ہے اور وہ مال کسی قدرتی آفت سے ہلاک ہو جاتا ہے اب یہ اپنے شریک سے کس تناسب سے نقصان کے ضمان کا مطالبہ کرے گا؟

ضابطہ تو یہ ہے کہ **الوضیعۃ علی قدر راس مالھما** یعنی نقصان ان دونوں پر ان کے سرمایہ کے بقدر ہوگا۔ یہاں تو یہ طے ہی نہیں ہوا کہ دونوں کا سرمایہ کتنا ہوگا اس لئے یہ دوسرے شریک سے کچھ مطالبہ نہیں کر سکے گا۔

3- سرمایہ کی تبدیلی کا شرکت پر اثر پڑتا ہے

شراکت ہو یا مضاربت مجلّہ کے مادہ 1411 کے تحت دونوں میں سرمایہ کا معلوم ہونا شرط ہے۔ اب ایک دفعہ سرمایہ دینے کے بعد کھاتہ دار اگر مضاربہ اکاؤنٹ میں سے کچھ رقم نکلوا لے یا اس میں مزید ڈال دے تو یہ ایک ہی مضاربت کا تسلسل نہیں رہے گا بلکہ دوسری مضاربت بن جائے گی۔ شرح مجلّہ میں ہے:

دفع الی رجل الفا بالنصف ثم الفا اخری کذلک فخلط المضارب المالین فھو علی ثلاثۃ اوجہ اما ان یقول المالک فی کل من المضاربتین اعمل برایک. (ج 4 ص 345)

(ترجمہ: ایک نے دوسرے کو نصف نفع پر ایک ہزار روپیہ دیا۔ بعد میں ایک ہزار روپیہ اسی شرط پر اور دیا۔ مضارب نے دونوں مالوں کو خلط کر دیا تو اس کی تین صورتیں ہیں۔ یا تو رب المال نے دونوں مضاربتوں میں سے ہر ایک کے بارے میں کہا ہو کہ تم اپنی صوابدید پر عمل کرو۔)

دیکھئے یہاں ان کو دو مضاربتیں شمار کیا گیا ہے جب کہ مولانا عثمانی مدظلہ ان کو ایک ہی

مضاربت کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ایک مضاربت میں مزید مال ڈالا جائے تو وہ یا تو دو مضاربتیں بن جائیں گی یا پچھلی مضاربت ختم ہو کر نئی مضاربت بن جائے گی اور اگر مضاربت میں سے کچھ رقم نکال لی تو وہ لامحالہ نئی مضاربت میں تبدیل ہو جائے گی۔

4- مضاربت و شرکت کے نفع کا ضابطہ معطل ہوتا ہے

مذکورہ بالا صورتوں میں **الربح علی ما اصطلحا علیہ** پر عمل کیونکر ہو سکے گا کیونکہ نفع کی شرح طے کرنے میں عمل اور سرمایہ کی مقدار دونوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے مثلاً دس لاکھ کا سرمایہ ہونے پر مضارب 40 فیصد یا اس سے بھی کم حصہ پر کام کے لئے تیار ہو گا جب کہ صرف ایک لاکھ کا سرمایہ ہونے پر وہ شاید نفع کے 60 فیصد سے کم لینے پر راضی نہ ہو۔

تنبیہ: اگر کوئی کہے کہ تمہارے دعوے کے برخلاف شرح مجلّہ میں یہ مذکور ہے:

ان قال رجل لغیرہ ما اشتریت من شئ فبینی و بینک او قال فبیننا و قال الآخر نعم فان ارادا بذلک ان یکونا بمعنی شریکی التجارۃ کان شرکۃ حتی یصح من غیر بیان جنس المشتری او نوعہ او قدر الثمن.

(ترجمہ: ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ جو کچھ تم خریدو وہ میرے اور تمہارے درمیان ہے یا کہا کہ وہ ہمارے درمیان ہے۔ دوسرے نے کہا کہ اچھا۔ پھر اگر اس سے دونوں کی مراد یہ ہے کہ وہ تجارت میں شریک ہوں تو یہ شرکت ہو گی اور خریدی جانے والی چیز کی جنس، نوع اور قیمت کی مقدار کے بیان کی حاجت نہیں۔)

کیونکہ اس مثال میں پہلے نے نہ تو اپنا سرمایہ حاضر کیا اور نہ یہ بتایا کہ خریدی ہوئی شے میں اس کا کتنا حصہ ہو گا۔

ہم کہتے ہیں

اس مثال میں جب ایک نے کہا کہ تم جو کچھ خریدو وہ ہمارے درمیان ہے اس سے

عرف میں نصف نصف سمجھا جاتا ہے۔لہٰذا اس شے کے نصف میں پہلے کی ملکیت بھی ثابت ہوگی اور اس شے کی نصف قیمت کا وہ ضامن بھی ہوگا۔اسی کے موافق ردالمحتار میں بھی ہے:

قال فی الولوالجیة قال لغیرہ ما اشتریت من شئ فھو بینی و بینک او اشترکا علی ان ما اشتریا من تجارۃ فھو بیننا یجوز ولا یحتاج فیه الی بیان الصفة والقدر والوقت لان کلا منھما صار وکیلا عن الآخر فی نصف ما یشتریه. (ج 3 ص 376)

پھر یہ مذکورہ معاملہ صرف ایک چیز خریدنے تک محدود ہوگا اور دونوں کے مالی حالات اس میں ملحوظ رہیں گے۔اس سے یہ سمجھنا کہ دوسرا مطلق کو مطلق مان کر خریداری کرتا چلا جائے اور ضروری قیودات کا لحاظ نہ کرے درست نہیں۔لہٰذا یہ مثال بھی ابتداءً سرمایہ کی اجمالی تعیین ہی کی ہے۔

اس کے برعکس یومیہ پیداوار والے طریقہ میں ابتداءً سرمایہ کی تعیین ہوتی ہی نہیں نہ صریح بیان سے، نہ نوٹوں کی ڈھیری دیکھنے سے اور نہ شرح کے تناسب کے ذکر سے۔

باب:3

یومیہ پیداوار کے طریقے پر ہمارا دوسرا اعتراض

اور مولانا عثمانی مدظلہ کے جواب کا جائزہ

جناب عمران اشرف عثمانی نے لکھا تھا کہ

''چند ہم عصر علماء نفع کی تعیین کے اس طریقے کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے خیال میں یہ ایک محض تخمینی طریقہ ہے جس سے مشارکہ میں کسی شریک کا کمایا ہوا حقیقی نفع معلوم نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کاروبار میں بہت زیادہ نفع ان دنوں میں ہوا ہو جب ایک شریک کا سرے سے یا تو سرمایہ ہی موجود نہ ہو یا ہو تو اتنا تھوڑا کہ قابل ذکر ہی نہ ہو۔ اس کے باوجود اس کو ان دوسرے شرکاء کے برابر سمجھا جائے گا جنہوں نے اس مدت میں بہت بڑی مقدار میں سرمایہ لگایا ہو۔ اس کے برعکس صورت میں یہ ممکن ہے کہ کاروبار کا اس مدت میں بہت زیادہ نقصان ہوا ہو جب ایک شریک کا بہت زیادہ سرمایہ لگا ہو۔ اس کے باوجود اس کا کچھ نقصان ان دیگر شرکاء کو منتقل کر دیا جائے گا جن کا اس مدت میں کچھ بھی سرمایہ نہ ہو یا ہو تو بہت تھوڑا جو نا قابل ذکر ہو۔

ان علماء کی دی ہوئی دلیل کو اس بنیاد پر رد کیا جا سکتا ہے کہ مشارکہ میں یہ تو ضروری ہے ہی نہیں کہ شریک صرف اپنے سرمایہ پر نفع کمائے۔ جب ایک دفعہ مشارکہ طے ہو جاتا ہے تو تمام ہی شرکاء اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ کسی خاص عقد میں ان کا سرمایہ استعمال ہوا ہے یا نہیں مشارکہ سے حاصل

ہونے والے نفع میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر حنفیہ کے نزدیک زیادہ مؤثر ہے کیونکہ ان کے یہاں مشارکہ کے جواز کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ تمام شرکاء کے سرمایوں کومخلوط کر دیا جائے۔''

ہم کہتے ہیں

اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اس طریقے سے کسی شریک کے واقعی نفع کی صحیح مقدار معلوم نہیں ہوتی کیونکہ فرض کریں مشارکت کی کل مدت ایک سو دن ہے۔ مدت کے شروع ہی میں عمر نے پانچ ہزار اور بکر نے دس ہزار جمع کرائے۔ اور پوری مدت میں کچھ رقم نہ نکلوائی۔ ان کے مقابلہ میں زید نے شروع میں پانچ ہزار جمع کرائے اور دس دن بعد وہ نکلوا لئے۔ آخر کے دس دنوں میں پانچ ہزار روپے پھر جمع کرا دیئے۔

ان سو دنوں کا سرمایہ ہوا............سولہ لاکھ

یعنی عمر کے 5000 روپے x100 دن =5,00,000 (5 لاکھ)

اور بکر کے 10,000 روپے x100 دن =10,00,000 (10 لاکھ)

اور زید کے 5,000 روپے x20 دن =100,000 (1 لاکھ)

100 دن میں کل 16 لاکھ روپے استعمال میں رہے تو ایک دن میں 16 ہزار روپے استعمال میں رہے۔ اگر کل نفع 8000 روپے ہو تو یومیہ بنیاد کے حساب سے عمر کا نفع ہوا 2500 روپے اور بکر کا ہوا 5000 روپے اور زید کا ہوا 500 روپے۔ اب یہ ممکن ہے کہ 8000 روپے کا نفع درمیان کے انہی دنوں میں ہوا ہو اور شروع و آخر کے دس دس دنوں میں کچھ بھی نفع نہ ہوا ہو۔ زید کو بلاوجہ دوسروں کے سرمایوں پر ہونے والے نفع میں سے 500 روپے مل گئے۔ ایسے ہی نقصان کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ (جدید معاشی مسائل: ص 145,147)۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ اپنی کتاب غیر سودی بینکاری میں یومیہ پیداوار کے طریقے کے متعلق لکھتے ہیں:

ان اصولوں اور احکام کو ذہن میں رکھتے ہوئے غیر سودی بینکوں میں شرکت ومضاربت قائم کرنے اور یومیہ پیداوار کی بنیاد پر نفع ونقصان کی تقسیم پر غور کیا جائے تو اس میں روایتی طریق کار سے دو چیزوں میں فرق نظر آتا ہے۔ایک یہ کہ اس میں شرکاء وقفے وقفے سے آرہے ہیں، اور انہیں ان کی مدت شرکت کے حساب سے نفع یا نقصان میں شریک کیا جارہا ہے، اور دوسرا یہ کہ بہت سے لوگ مدت شرکت ختم ہونے سے پہلے کلی یا جزوی طور پر اس سے نکل بھی رہے ہیں۔اب ان دونوں پہلوؤں پر الگ الگ گفتگو مناسب ہوگی۔

جہاں تک شرکاء کے وقفے وقفے سے شرکت میں داخل ہونے کا تعلق ہے، اس کے لئے ایک سادہ سی مثال پر غور کرلیں۔فرض کیجئے زید اور عمرو کا ایک چلتا ہوا کاروبار ہے جو مختلف نوعیت کے معاملات پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں اپنے نفع ونقصان کا حساب سالانہ یکم رمضان کو کرتے ہیں۔اب یکم رمضان سے چھ مہینے پہلے بکر ان سے کہتا ہے کہ میں بھی آپ کے کاروبار میں سرمایہ ڈال کر شریک ہونا چاہتا ہوں، چونکہ زید اور عمرو کو بھی اپنے کاروبار میں وسعت لانے کے لئے مزید سرمائے کی ضرورت ہے، اس لئے وہ بکر کو شریک کرنے پر رضامند ہوجاتے ہیں، اور یہ طے کرتے ہیں کہ بکر اتنا سرمایہ کاروبار میں ڈالے گا جس سے وہ کاروبار کے ایک تہائی حصے میں شریک ہوجائے، اور نفع کا تناسب بھی تینوں شرکاء کا ایک ایک تہائی ہوگا، البتہ یکم رمضان کو جب نفع ونقصان کا حساب ہوگا تو چونکہ بکر کی حصہ داری صرف چھ ماہ رہی ہے جو دوسرے دو حصہ داروں کے مقابلے میں آدھی ہے، اس لئے وہ ایک تہائی نفع کے نصف، یعنی چھٹے حصے کا حق دار ہوگا۔اگر تینوں فریق اس پر متفق ہوجائیں تو بظاہر ''**الربح علی ما اصطلحا علیہ**'' کے قاعدے کے عموم کے پیش

نظر اس میں شرکت کے کسی بنیادی اصول کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی۔ بس یومیہ پیداوار کی بنیاد پر نفع کی تقسیم کا یہی مطلب ہے۔

اس پر بنیادی اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ نفع کا جو حساب آخر میں کیا گیا ہے، اس میں وہ نفع بھی شامل ہو جاتا ہے جو صرف زید اور عمرو کے مال پر ہوا جو ابتدا ہی سے شریک تھے، لیکن اُس میں حصہ دار بکر بھی ہو رہا ہے جو بعد میں شریک ہوا جب کہ اُس وقت وہ کاروبار میں شریک نہیں تھا۔

اس اشکال کے بارے میں عرض یہ ہے کہ چونکہ بکر شروع کے کاروبار میں شریک نہیں تھا، اسی لئے اس کا نفع کا حصہ بھی اسی نسبت سے کم ہو گیا ہے۔ اس لئے اس میں عدل وانصاف کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔

(غیر سودی بینکاری ص: 317`316)

ہم کہتے ہیں

اس عبارت میں مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی دو باتیں محل نظر ہیں:

1- مولانا مدظلہ کا یہ کہنا کہ اس میں عدل وانصاف کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔

2- مولانا مدظلہ کا یہ کہنا کہ شرکت قائم ہو جانے کے بعد یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس کے روپے پر کتنا نفع ہوا۔

ان دونوں باتوں پر ہم آگے علیحدہ علیحدہ عنوان سے تفصیل سے لکھتے ہیں:

مولانا مدظلہ کے قول کے برعکس یومیہ پیداوار کا طریقہ عدل وانصاف کے خلاف ہے

مولانا مدظلہ نے لکھا ہے:

"اس اشکال کے بارے میں عرض یہ ہے کہ چونکہ بکر شروع کے کاروبار میں شریک نہیں تھا اسی لئے اس کا نفع کا حصہ بھی اسی نسبت سے کم ہوگیا ہے۔ اس لئے اس میں عدل و انصاف کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔"

ہم کہتے ہیں

یہ تو ٹھیک ہے کہ سرمایہ کے استعمال کی مدت کم ہونے سے نفع کا حصہ بھی کم ہوا ہے لیکن یومیہ پیداوار کے طریقہ پر حساب صرف اسی وقت صحیح بنتا ہے جب دونوں شش ماہیوں کا نفع برابر ہو مثلا:

زید وعمرو کی شراکت میں پہلے 6 ماہ کا نفع ہوا۔	3000 روپے
زید، عمرو اور بکر کی شراکت میں دوسرے 6 ماہ کا نفع ہوا	3000 روپے
کل نفع ہوا	6000 روپے
اس کا چھٹا حصہ بنا	1000 روپے

اور اگر دونوں شش ماہیوں کا نفع مختلف ہو تو ہمارا اصل اعتراض باقی رہتا ہے مثلاً

زید وعمرو کی شراکت میں پہلے 6 ماہ کا نفع ہوا۔	4500 روپے
زید، عمرو اور بکر کی شراکت میں دوسرے 6 ماہ کا نفع ہوا۔	3000 روپے

ضابطہ کے مطابق زید کا نفع بنتا ہے صرف 1000 روپیہ لیکن مولانا تقی عثمانی مدظلہ

کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق بکر کو ملتے ہیں 1250 روپے۔ان میں سے 250 روپے وہ ہیں جو صرف زید وعمرو کی شراکت کے نفع کا جزو ہے۔

اسی طرح اگر زید وعمرو کی شراکت میں پہلے 6 ماہ کا نفع ہوا۔	2000روپے
زید، عمرو اور بکر کی شراکت میں دوسرے 6 ماہ کا نفع ہوا۔	3000روپے
پورے سال کا نفع ہوا۔	5000روپے
بکر کو اس کا چھٹا حصہ ملا	833.33روپے

جب کہ ضابطہ کے مطابق بکر کا حصہ 1000 روپے بنتا ہے

غرض یہ دعویٰ کہ اس طریقے میں عدل وانصاف کے خلاف کوئی بات نہیں ہے قابل تسلیم نہیں ہے۔

مولانا مدظلہ کے قول کے برعکس شریک محض اپنے سرمائے اور عمل پر نفع لیتا ہے

مولانا تقی عثمانی مدظلہ پیچھے مذکور اعتراض کا جواب یوں دیتے ہیں:

''شرکت قائم ہو جانے کے بعد یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس کے روپے پر کتنا نفع ہوا، بلکہ سب لوگوں کا سرمایہ شرکت کے حوض میں جانے کے بعد مخلوط ہو جاتا ہے۔اسی لئے نفع میں شرکاء کے درمیان کمی بیشی جائز ہے۔

ہم کہتے ہیں

اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے مولانا مدظلہ نے چھ مثالیں دی ہیں۔لیکن ان کی حقیقت وہ نہیں ہے جو مولانا مدظلہ بتانا چاہتے ہیں بلکہ اور ہے۔اس لئے ہم ان میں سے ایک ایک کو نقل کر کے اس پر تبصرہ بھی پیش کرتے ہیں۔

پہلی مثال

مولانا تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

فرض کیجئے کہ زید کا سرمایہ کاروبار میں چالیس فی صد ہے، اور عمرو کا ساٹھ فی صد اور کام دونوں کرتے ہیں۔اگر وہ باہمی رضامندی سے یہ معاہدہ کریں کہ زید کو نفع کا ساٹھ فی صد ملے گا، اور عمرو کو چالیس فی صد، تو یہ صورت مذکورہ بالا آثار کی روشنی میں جائز ہے، اور فقہاء حنفیہ بھی اسے جائز کہتے ہیں۔ اب زید کے ساٹھ فی صد نفع میں سے دو تہائی یعنی چالیس فی صد تو زید کے اپنے سرمائے کے حصے اور اپنے عمل سے حاصل ہوا ہے، اور باقی بیس فی صد عمرو کے لگائے ہوئے سرمائے اور عمل سے، لیکن اس کے لئے یہ بیس فی صد

نفع بھی طے شدہ شرط کے مطابق حلال ہے۔''

(غیر سودی بینکاری ص318)

ہمارا تبصرہ

ہم کہتے ہیں مولانا مدظلہ کا یہ کہنا کہ

''اب زید کے ساٹھ فیصد نفع میں سے دو تہائی یعنی چالیس فیصد تو زید کے اپنے سرمائے کے حصے اور اپنے عمل سے حاصل ہوا ہے، اور باقی بیس فی صد عمرو کے لگائے ہوئے سرمائے اور عمل سے، لیکن اس کے لئے یہ بیس فی صد نفع بھی طے شدہ شرط کے مطابق حلال ہے۔''

اصولی طور پر غلط ہے اور زید کو پورے ساٹھ فیصد اپنے سرمائے اور اپنے عمل کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں اور وجہ یہ ہے کہ عمرو کے عمل کے مقابلہ میں اس کے عمل کی قیمت زیادہ طے ہوئی ہے۔ دیکھئے مجلّہ کے مادہ 1345 میں ہے:

العمل يكون متقوما بالتقويم يعنى ان العمل يتقوم بتعيين القيمة و من الجائز ان يكون عمل شخص اكثر قيمة بالنسبة الى عمل شخص آخر مثلا اذا كان شريكان شركة عنان و راس مالهما متساويا و كلا هما ايضا مشروط عمله و شرط اعطاء احدهما حصة زائدة من الربح يكون الشرط جائزا لانه يجوز ان يكون احدهما فى الاخذ والعطاء امهر و عمله انفع.

(ترجمہ: عمل قیمت طے کئے جانے سے متقوم ہوتا ہے اور یہ جائز ہے کہ ایک شخص کے عمل کی قیمت دوسرے کے عمل کی قیمت سے زیادہ ہو۔ مثلا شرکت عنان کے دو شریک ہوں، دونوں کا مال بھی برابر ہو اور دونوں پر عمل بھی شرط ہو پھر بھی یہ شرط ہو کہ نفع میں ایک کا حصہ زیادہ ہوگا تو یہ شرط جائز ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ شخص کاروباری لین دین کا زیادہ ماہر ہو اور اس کے عمل کا فائدہ بھی زیادہ ہو۔)

آگے شارح مجلّہ لکھتے ہیں:

حتی لو شرطا اکثر الربح لادنا ھما عملا لا تصح الشرکة اتفاقا. (شرح المجلہ ص 267 ج 4)

(ترجمہ: اگر زیادہ نفع اس کو دینا طے کیا جس کا عمل واضح طور پر کم ہو (جب کہ سرمایہ دونوں کا برابر ہو) تو بالاتفاق یہ شرکت صحیح نہ ہو گی (کیونکہ اس صورت میں یہ شریک دوسرے کے سرمائے اور عمل سے فائدہ اٹھاتا ہے)۔

ولو کان الاکثر لغیر العامل...... لایصح ولہ ربح مالہ فقط. (شرح المجلہ ص 268 ج 4)

(ترجمہ: اور اگر غیر عامل کے لئے زیادہ نفع شرط کیا گیا ہو تو یہ صحیح نہیں اور اس کو صرف اس کے مال کے بقدر ہی نفع ملے گا (اور وہ دوسرے کے سرمائے اور عمل سے کچھ نہ پائے گا)۔

البتہ ایک صورت یہ ہے:

اما اذا اشترطا التفاضل بالربح و سکتا عن ذکر اشتراط العمل یکون شرط التفاضل بالربح معتبرا سواء عملا او عمل احدھما فقط لعذر او لغیر عذر و سواء کانت الزیادۃ مشروطۃ لمن عمل او الآخر. (شرح المجلہ ص 296 ج 4)

(ترجمہ: اگر ایک شریک کے لئے نفع کی شرح زیادہ رکھی گئی اور عمل کی شرط کے بارے میں کچھ ذکر نہ کیا تو زائد نفع کی شرط معتبر ہو گی خواہ عمل دونوں نے کیا ہو یا صرف ایک نے کیا ہو اور دوسرے نے کسی عذر سے یا بلا کسی عذر کے عمل نہ کیا ہو اور خواہ عمل کرنے والا زائد نفع والا ہو یا دوسرا ہو۔)

اس مسئلہ سے کسی کو خیال ہو سکتا ہے کہ جب سرمایہ دونوں کا برابر ہے تو ایک دوسرے کے سرمائے سے زیادہ نفع لے رہا ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اگرچہ عمل کی شرط ذکر نہیں ہوئی لیکن عمل ناگزیر ہے اس لئے ملحوظ

(Understood) ہوگا کہ دونوں ہی عمل کریں گے اور ایک کے عمل کی قیمت دوسرے سے زیادہ ہے۔ پھر اگر فقط ایک نے عمل کیا تو یہ اس کا احسان و تبرع ہے۔

دوسری مثال

مولانا مدظلہ لکھتے ہیں:

اس سے بھی زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ اگر زید اور عمرو نے شرکت کا عقد کر لیا، لیکن اپنا سرمایہ اکٹھا نہیں کیا۔ اس کے باوجود اگر زید صرف اپنے مال سے شرکت کے لئے کوئی چیز خرید کر بیچے تو اس کے نفع میں دونوں شریک ہوں گے، اور اگر خریداری کے بعد وہ چیز تباہ ہو جائے تو اس کا نقصان بھی دونوں اٹھائیں گے۔ بدائع الصنائع میں ہے:

"أما قوله الشركة تنبیء عن الاختلاط فمسلم، لكن على اختلاط راس المال او على اختلاط الربح؟ فهذا ممالايتعرض له لفظ الشركة،فيجوز أن يكون تسميته شركة لاختلاط الربح لا لاختلاط رأس المال، و اختلاط الربح يوجد إن اشترى كل واحد بمال نفسه على حدة، لأن الزيادة، وهي الربح، تحدث على الشركة...... حتى لو هلك بعد الشراء بأحدهما كان الهالك من المالين جميعا لأنه هلك بعد تمام العقد."

(بدائع الصنائع ج 6 ص 60 ط کراچی)

(غیر سودی بینکاری ص318)

ہمارا تبصرہ

مولانا عثمانی مدظلہ نے اس کو زیادہ واضح مثال کہا ہے لیکن یہ ان کے حق میں نہیں بلکہ ان کے خلاف ہونے میں زیادہ واضح ہے۔ وجوہ درج ذیل ہیں۔

i- مولانا مدظلہ نے یہ ضابطہ تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ:

الربح علی ما اصطلحا علیه و الو ضیعة علی قدر المال.

یعنی نفع اس بنیاد پر تقسیم ہوگا جس پر شرکاء متفق ہو جائیں اور نقصان ہمیشہ سرمایہ کے بقدر ہوگا۔ (غیر سودی بینکاری ص 308)

پھر مولانا مدظلہ کے نزدیک پہلے سے راس المال کا معلوم ہونا شرط نہیں ہے۔ اب جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں مولانا مدظلہ کی اس ذکر کردہ مثال میں زید نے اپنے مال سے شرکت کے لئے ایک چیز خریدی اور وہ تباہ ہوگئی۔ تو عمرو کس شرح سے نقصان میں شریک ہوگا؟ اس نے نہ تو اپنے راس المال کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی اس نے اپنے مال سے شرکت کے لئے کچھ خریدا ہے۔ پھر وہ نقصان میں کیوں شریک ہو اور ہو تو کس شرح سے ہو؟

ii- مولانا عثمانی مدظلہ نے یہ لکھ کر کہ ''اگر زید صرف اپنے مال سے شرکت کے لئے کوئی چیز خرید کر بیچے تو اس کے نفع میں دونوں شریک ہوں گے''۔ یہ تاثر دیا ہے کہ عمرو کو جو نفع مل رہا ہے وہ اس کی اپنی کسی ذمہ داری سے نہیں بلکہ محض زید کے سرمائے سے مل رہا ہے۔

یہ بات بھی غلط ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عمرو جو نفع لیتا ہے وہ اپنی ذمہ داری (ضمان) کی وجہ سے لیتا ہے۔ مجلّہ کے مادہ 1347 میں ہے:

کما ان استحقاق الربح یکون تارة بالمال او بالعمل کذلک بحکم المادة 85 یکون تارة با لضمان.

(ترجمہ: نفع میں استحقاق جیسے مال یا عمل سے ہوتا ہے اسی طرح ضمان (ذمہ داری) سے بھی ہوتا ہے۔)

اور ذمہ داری دو قسم کی ہوتی ہے۔ مال کی بھی اور عمل کی بھی۔ شرح مجلّہ میں ہے۔

و فی شر کة الوجوه بالضمان ای ضمان قیمة ما یشتر یانه بو جوههما و لهذا لا یستحق الربح احد هما الا بمقدار حصته من المشری فان شرطا

مناصفة المشتری او مثالثته فالربح کذلک.

(ترجمہ: شرکت وجوہ میں نفع کا استحقاق اپنی وجاہت اور اثر رسوخ سے ادھار خریدی ہوئی شے کی قیمت کے ضمان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی لئے ایک شریک خرید شدہ شے میں اپنے حصہ سے زیادہ کی مقدار میں نفع کا استحقاق نہیں رکھتا۔ اگر خرید شدہ شے میں دونوں نے نصف نصف یا دوتہائی اور ایک تہائی کی شرط کی تو نفع بھی اسی نسبت سے ہوگا۔)

شرکت وجوہ میں ایک شریک کوئی شے ادھار خریدے تو دوسرا شریک اس میں اپنے حصہ کے بقدر قیمت کا ضامن ہوتا ہے۔ اسی طرح شرکت عنان میں جب ایک شریک اپنے سرمایہ سے کوئی شے نقد خریدتا ہے تو دوسرا اس میں اپنے حصہ کے بقدر پہلے شریک کے لئے قیمت کا ضامن ہوتا ہے اور اسی وجہ سے شے کے تباہ ہونے کی صورت میں دونوں شریک اپنے حصوں کے بقدر نقصان برداشت کرتے ہیں۔

تیسری مثال

مولانا مدظلہ لکھتے ہیں:

اسی طرح شرکۃ الاعمال میں اگر ایک شریک نے کوئی عمل نہ کیا ہو، تب بھی وہ اس اجرت میں شریک ہوتا ہے جو دوسرے شریک کے عمل پر ملی ہو، چنانچہ مبسوط سرخسی میں ہے:

"قال: والشریکان فی العمل إذا غاب أحدهما أو مرض أو لم یعمل و عمل الآخر: فالربح بینهما علی ما اشترطا: لما روی أن رجلا جاء إلی رسول الله ﷺ فقال: أنا أعمل فی السوق ولی شریک یصلی فی المسجد، فقال رسول الله ﷺ: (لعلک برکتک منه) والمعنی أن استحقاق الأجر بتقبل العمل دون مباشرته، والتقبل کان منهما و إن باشر العمل أحدُهما. ألا تری أن المضارب إذا استعان برب المال فی بعض العمل کان الربح

بينهما على الشرط. أو لا ترى أن الشريكين فى العمل يستويان فى الربح وهما لا يستطيعان أن يعملا على وجه يكونان فيه سواء، وربما يشترط لأحدهما زيادة ربح لحذاقته وإن كان الآخر أكثر عملا منه، فكذالک يكون الربح بينهما على الشرط ما بقى العقد بينهما وإن كان المباشر للعمل أحدهما، ويستوى إن امتنع الآخر من العمل بعذر أو بغير عذر، لأن العقد لا يرتفع بمجرد امتناعه من العمل واستحقاق الربح بالشرط فى العقد.''

(المبسوط، اوائل كتاب الشركة ج 11 ص 157 ، 158 : دار المعرفة)

(غیر سودی بینکاری ص319)

ہمارا تبصرہ

ہم کہتے ہیں کہ اس مثال سے بھی مولانا مدظلہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شرکت کا معاملہ کر لینے کے بعد نفع کی تقسیم میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک کو اپنے سرمائے اور عمل سے کچھ مل رہا ہے یا دوسرے کے سرمائے اور عمل سے۔ مولانا مدظلہ کی یہ بات غلط ہے۔ مذکورہ مثال میں دیا گیا مسئلہ مجلّہ کے مادہ 1349 میں یوں مذکور ہے:

استحقاق الربح انما هو بالنظر الى الشرط المذكور فى عقد الشركة وليس هو بالنظر الى العمل الواقع فالشريک المشروط عمله و لو لم يعمل يعد كانه عمل مثلا الشريكان شركة صحيحة فى حال اشتراط العمل على كليهما اذا عمل احدهما ولم يعمل الآخر بعذر او بغير عذر يقسم الربح بينهما على الوجه الذى اشترطاه حيث كل منهما وكيل عن الآخر فبعمل شريكه يعد هو ايضا كانه عمل.

(ترجمہ: شرکت کے معاملہ میں نفع کا استحقاق طے شدہ شرط کی بنیاد پر ہوتا ہے واقعی

عمل کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ شریک جس پر عمل کرنا شرط ہوا گرچہ عمل نہ کرے عمل کرنے والے کی مثل شمار ہوتا ہے۔ مثلاً شرکت صحیح ہوا اور دونوں شریکوں پر عمل کرنا شرط ہو پھر ان میں سے ایک عمل کرے اور دوسرا کسی عذر سے یا بلا کسی عذر کے عمل نہ کرے تب بھی نفع شرط کے مطابق تقسیم ہوگا کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے اور ایک کا عمل دوسرے کا عمل شمار ہوتا ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ دونوں نے شرکت اعمال کا معاملہ کیا جس میں دونوں پر عمل کی شرط طے ہوئی۔ عمل کی شرط کی وجہ سے نفع میں استحقاق ثابت ہوا۔ شرکت کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے وکیل بھی بن گئے۔ اب اگر ایک کام نہ کرے تو دوسرا اس کو کام کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن اگر دوسرا لحاظ داری رکھتے ہوئے اکیلا ہی کام کر دے تو چونکہ شرکت قائم ہے اور وکیل کا عمل مؤکل کا عمل شمار ہوتا ہے اس لئے کام نہ کرنے والے کو کام کرنے والا سمجھا جائے گا اور نفع سے محروم نہ کیا جائے گا۔

چوتھی مثال

مولانا عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

''نیز شرکۃ الوجوہ میں مال کسی بھی شریک کا نہیں ہوتا، اور شرکت صرف اس بات کے لئے ہوتی ہے کہ دو آدمی محض اپنی ساکھ کی بنیاد پر سودا ادھار خرید کر بازار میں بیچتے ہیں۔ پھر اگر ان میں سے ایک شریک صرف اپنی وجاہت کی بنیاد پر کچھ مال خریدے، دوسرا نہ موجود ہو، اور نہ بیچنے والا اسے جانتا ہو، تب بھی وہ اس مال میں شریک سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ بدائع میں ہے:

''حتى لو اشتركا بوجوههما على أن يكون ما اشتريا أو أحدهما بينهما نصفين أو أثلاثا أو أرباعا و كيف ما شرطا على التساوي و التفاضل: كان جائزا وضمان ثمن المشتري بينهما

على قدر ملكيهما فى المشترى. والربح بينهما على قدر الضمان.

(بدائع الصنائع، كتاب الشركة ج 5 ص 87)

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں قسم کی شرکتوں کے جواز پر اس طرح استدلال فرمایا ہے:

”ولنا: أن الناس يتعاملون بهذين النوعين فى سائر الأعصار من غير إنكار عليهم من أحد. وقال عليه الصلاة والسلام: لا تجتمع أمتى على ضلالة: ولأنهما يشتملان على الوكالة والوكالة جائزة والمشتمل على الجائز جائز و قوله: إن الشركة شرعت لا ستنماء المال فيستدعى أصلا يستنمى فنقول: الشركة بالأموال شرعت لتنمية المال و أما الشركة بالأعمال أو بالوجوه فما شرعت لتنمية المال بل لتحصيل أصل المال، والحاجة إلى تحصيل أصل المال فوق الحاجة إلى تنميته فلما شرعت لتحصيل الوصف فلأن تشرع لتحصيل الأصل أولى. ...... و كذا بُعث رسول الله ﷺ والناس يتعاملون بهذه الشركة فقررهم على ذلك حيث لم ينههم ولم ينكر عليهم، والتقرير أحد وجوه السنة، ولأن هذه العقود شرعت لمصالح العباد، وحاجتهم إلى استنماء المال متحققة. و هذا النوع طريق صالح للاستنماء فكان مشروعا: ولأنه يشتمل على الوكالة والوكالة جائزة إجماعا.“

(بدائع الصنائع، كتاب الشركة ج 6 ص 58)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ شرکت میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس کے روپے پر کتنا نفع ہوا، بلکہ مجموعی نفع، خواہ کسی کے روپے سے حاصل ہوا ہو، اسی کو

شرکاء کے درمیان طے شدہ تناسب سے تقسیم کیا جاتا ہے۔

(غیر سودی بینکاری ص318 تا 321)

ہمارا تبصرہ

شرکت وجوہ سے متعلق بات ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں کہ مال کے ضمان کی وجہ سے ایک شریک دوسرے کے خریدے ہوئے سامان میں اپنے حصے کے بقدر قیمت کا ضامن (ذمہ دار) ہوتا ہے۔ یہ ضمان (ذمہ داری) بھی ایک عمل ہے اور اس عمل کی بنیاد پر نفع میں استحقاق آتا ہے۔

پانچویں مثال

مولانا مدظلہ لکھتے ہیں:

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں:

"إذا أقعد الصائغ معه رجلاً في دكانه، فطرح عليه العمل بالنصف، جاز استحساناً، لتعامل الناس من غير نكير منكر، ولأن الناس بحاجة إلى ذلك، فالعامل قد يدخل بلداً لا يعرفه اهلها، ولا يأمنونه على متاعهم، و إنما يأمنون على متاعهم صاحب الدكان الذي يعرفونه، وصاحب الدكان لا يتبرع على العامل بمثل هذا في العادة، ففي تجويز هذا العقد يحصل غرض الكل، فإن العامل يصل إلى عوض عمله، وصاحب الدكان يصل إلى عوض منفعة دكأنه، والناس يصلون إلى منفعة عمل العامل. و يطيب لرب الدكان الفضل، لأنه أقعده في دكانه، وأعانه بمتاعه، و ربما يقيم صاحب الدكان بعض العمل، كالخياط يتقبل الثوب، ويلي قطعه، ثم يدفع إلى آخر بالنصف.

قال شمس الأئمة السرخسي رحمه الله تعالىٰ: هذا العقد

نظير عقد السلم، من حيث أنه رخص فيه لحاجة الناس.“
(المحيط البرهاني، كتاب الشركة، الفصل الأول، ج 8 ص 355ط: إدارة القرآن)

(غیر سودی بینکاری ص321,322)

ہمارا تبصرہ

اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نفع کے استحقاق کی تین وجہیں ہیں (1) مال، (2) عمل، (3) ضمان۔

اور ہم یہ بھی ذکر کر چکے ہیں کہ ضمان دو طرح کا ہوتا ہے، مال کا اور عمل کا۔ اب یہ سمجھئے کہ ضمان بھی ایک طرح کا عمل ہوتا ہے۔

مجلّہ کے مادہ 1346 میں ہے:

ضمان العمل نوع من العمل (عمل کا ضمان بھی ایک طرح کا عمل ہے)

اب مولانا عثمانی مدظلہ کی دی ہوئی مثال کو سمجھئے۔ ایک شخص اپنی دکان پر مثلاً ایک رنگریز کو یا درزی کو بٹھاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ طے کرتا ہے کہ وہ کام وصول کرے گا اور جو اجرت وصول ہوگی وہ دونوں کے درمیان نصف نصف ہوگی۔ مولانا مدظلہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دکاندار نے کوئی عمل نہیں کیا پھر بھی معاملہ کرنے کی وجہ سے وہ دوسرے کے عمل کی اجرت میں حصہ دار بن گیا ہے۔

مجلّہ و شرح مجلّہ نے مولانا مدظلہ کی اسی غلط فہمی کو دور کیا ہے۔

مجلّہ میں ہے:

ضمان العمل نوع من العمل فاذا تشارك اثنان شركة صنائع بان وضع شخص في دكانه آخر من ارباب الصنايع على ان ما يتقبله هو ويتعهده من الاعمال يعمل الآخر ذلك و ما يحصل من الكسب يعنى الاجرة بينهما مناصفة تكون جائزة و استحقاق صاحب الدكان حصة النصف بسبب كونه

ضامنا و متعهدا للعمل. (ماده 1346)

(ترجمہ: عمل کا ضمان بھی ایک طرح کا عمل ہے۔ جب دو آدمی اس طرح سے شرکت صنائع کریں کہ ان میں سے ایک کسی کاریگر کو اپنی دکان پر بٹھائے اس شرط پر کہ وہ خود کام قبول کرے گا اور اس کی ذمہ داری لے گا اور دوسرا کام کرے گا اور جو اجرت حاصل ہوگی وہ دونوں میں نصف نصف ہوگی تو یہ جائز ہے۔ اور دکان والے کا نصف اجرت میں استحقاق اس سبب سے ہے کہ وہ ضامن ہے اور کام کا ذمہ دار ہے۔)

شرح مجلّہ میں ہے:

وهذه الجملة جواب عما يقال ان راس المال فی شرکة الصنائع هوالعمل کما سیاتی. فاذا لم یکن من احدهما عمل کیف یستحق ماشرط له...... وجوابه ان نفس التقبل والتعهد عمل فبسببه یستحق ما شرط له. (شرح المجله ص 270 ج 4)

(ترجمہ: مجلّہ کا یہ جملہ **ضمان العمل نوع من العمل** یعنی عمل کا ضمان بھی ایک طرح کا عمل ہے اس سوال کا جواب ہے کہ شرکت اعمال میں اصل سرمایہ عمل ہوتا ہے۔ پھر اگر ایک شریک پر عمل شرط نہ ہو تو وہ مشروط اجرت کا کیسے مستحق ہوگا؟...... اس کا جواب یہ ہے کہ کام وصول کرنا اور اس کی ذمہ داری لینا یہ خود ایک عمل ہے اور اس کی وجہ سے وہ مشروط اجرت کا مستحق بنتا ہے)۔

علاوہ ازیں خود صاحب محیط نے دکاندار کے حصہ کو بلا وجہ نہیں کہا بلکہ اپنی دکان کی منفعت کا عوض بتایا ہے۔ نیز کہا کہ دکان کا مالک بسا اوقات خود عمل بھی کرتا ہے۔ **(وربما یقیم صاحب الدکان بعض العمل).**

چھٹی مثال

مولانا عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

یہ درست ہے کہ جتنی مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں، وہاں اگرچہ ایک شخص

دوسرے کے مال، عمل یا وجاہت سے منتفع ہو رہا ہے، لیکن ان کے درمیان عقد پہلے سے موجود ہے، اور بینکاری کے طریق کار میں جو لوگ مدت شرکت شروع ہونے کے بعد آ رہے ہیں، وہ عقد میں پہلے سے شریک نہیں تھے، لیکن ایک نظیر ایسی بھی موجود ہے جہاں پہلے سے عقد نہ ہونے کے باوجود دو فریقوں کے درمیان مضاربت تسلیم کی گئی، اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور فیصلہ ہے جو مؤطا امام مالک میں منقول ہے، اور وہ یہ کہ اُن کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اور عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عراق گئے جہاں اس وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حاکم تھے، اور کچھ رقم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ منورہ بھیجنا چاہتے تھے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ صاحب زادے مدینہ منورہ جانے لگے تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ یہ رقم میں آپ کو قرض کے طور پر دیدیتا ہوں، آپ چاہیں تو اس کا سامان یہاں سے خرید کر وہاں بیچ دیں، نفع خود رکھ لیں، اور اصل رقم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیدیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے میرے بیٹوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے یہ معاملہ کیا ہے، اس لئے انہوں نے جو نفع کمایا ہے، وہ بیت المال کو واپس کریں۔ حضرت عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر یہ مال ہلاک ہو جاتا تو اس کی ذمہ داری ہم پر ہی ہوتی، اس لئے اس کا نفع بھی ہمیں ملنا چاہئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات نہیں مانی، پھر ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ آپ اسے مضاربت بنا دیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے مضاربت قرار دیکر آدھا نفع ان صاحبزادوں کو دیا اور آدھا نفع بیت المال میں داخل کروایا۔ (مؤطا امام مالک رحمہ اللہ، ما جاء فی القراض، حدیث نمبر 1195)

اس واقعے میں جب رقم ان صاحب زادوں کو دی گئی، اس وقت

مضاربت کا کوئی عقد نہیں تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعد میں اسے مضاربت قرار دیا۔ اس فیصلے کی فقہاء کرام رحمہ اللہ نے متعدد توجیہات کی ہیں، ان میں سے ایک توجیہ یوں فرمائی گئی ہے:

''إن عمر أجرى عليهما أجرا في الربح حكم القراض الصحيح، وإن لم يتقدم منهما عقد، لأنه كان من الأمور العامة ما يتسع حكمه عن العقود الخاصة، فلما رأى المال لغيرهما والعمل منهما ولم يرهما متعديين فيه، جعل ذلك عقد قراض صحيح، وهذا ذكره أبو علي ابن أبي هريرة.''

(المجموع شرح المهذب ج8ص 9) (غیر سودی بینکاری ص322,323)

هم کہتے ہیں

یہ پورا قصہ مؤطا امام مالک میں یوں ہے۔

خرج عبدالله و عبيد الله ابنا عمر بن الخطاب في جيش الى العراق. فلما قفلا مرا على ابي موسى الاشعري وهو امير البصرة فرحب بهما و سهل ثم قال لو اقدر لكما على امر انفعكما به لفعلت ثم قال بلى ههنا مال من مال الله اريد ان ابعث به الى امير المومنين فاسلفكماه فتتباعان به متاعا من متاع العراق ثم تبيعانه بالمدينة فتؤديان راس المال الى امير المومنين فيكون لكم الربح فقالا وددنا ففعل و كتب ذلك الى عمر بن الخطاب ان يا خذ منهما المال. فلما قدما باعا فاربحا. فلما دفعا ذلك الى عمر بن الخطاب قال اكل الجيش اسلفه مثل ما اسلفكما قالا لا فقال عمر بن الخطاب ابنا امير المومنين فاسلفكما اديا المال و ربحه. فاما عبدالله فسكت و اما عبيد الله فقال ما ينبغي لك يا امير المومنين هذا لو نقص المال او هلك لضمناه فقال عمر ادياه فسكت عبدالله و راجعه عبيد الله. فقال رجل من

جلساء عمر یا امیر المومنین لو جعلته قراضا فقال عمر قد جعلته قراضا. فاخذ عمر راس المال و نصف ربحه و اخذ عبدالله و عبید الله نصف ربح المال.

اس کا ترجمہ چند ضروری وضاحتوں کے ساتھ ذیل میں ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے عبداللہ اور عبید اللہ اسلامی لشکر کے ساتھ عراق گئے۔ جب وہ وہاں سے لوٹنے لگے تو ان کا گذر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پر ہوا جو بصرہ کے حاکم تھے۔ انہوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور کہا'' اگر میں کسی طریقے سے آپ دونوں کو نفع پہنچا سکا تو ضرور پہنچاؤں گا۔ پھر کہنے لگے ارے ہاں میرے پاس اللہ کا (یعنی سرکاری) مال موجود ہے جو میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ تو وہ مال میں آپ دونوں کو قرض دیتا ہوں۔ آپ اس رقم سے یہاں عراق کا کچھ سامان خرید لیں اور مدینہ پہنچ کر اس کو فروخت کر دیں۔ پھر اصل مال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ادا کر دیں اور نفع خود رکھ لیں۔ ان دونوں اس میں نے اپنی رغبت ظاہر کی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے رقم ان کو دے دی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تحریر لکھ دی کہ وہ رقم ان سے وصول کر لیں۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو انہوں نے سامان فروخت کیا اور نفع کمایا۔ جب انہوں نے اصل رقم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دی تو انہوں نے پوچھا کیا ابوموسیٰ نے تم دونوں کی طرح پورے لشکر کر (نفع کمانے کے لئے) قرض دیا ہے؟ ان دونوں نے جواب دیا کہ نہیں دوسروں کو نہیں دیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم دونوں امیر المومنین کے بیٹے ہو اس لیے ابوموسی نے صرف تمہیں قرض دیا۔ چلو اصل مال اور نفع سب نکالو (اور بیت المال میں جمع کراؤ کیونکہ ایک تو سرکاری مال پر نفع حاصل کیا ہے اور دوسرے میرے عہدے کی وجہ سے وہ تمہیں بلاواسطہ اور مجھے بالواسطہ فائدہ پہنچا رہے ہیں جس میں رشوت کی آمیزش ہے)۔

اس پر عبداللہ تو خاموش رہے لیکن عبید اللہ نے کہا اے امیر المومنین آپ کا یہ فیصلہ

مناسب نہیں ہے کیونکہ اگر مال کم ہو جاتا یا سارا جاتا رہتا تو اس کا تاوان تو ہم نے ہی دینا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (ان کی دلیل کو تسلیم نہیں کیا اس لیے کہ یہ سرکاری مال تھا جو قرض نہیں دیا جا سکتا تھا لہٰذا امانت تھا اور امین اگر امانت کے مال سے اپنا سامان خرید لے تو تاوان اس پر آتا ہی ہے۔ اور) فرمایا کہ (نہیں) تم سب رقم جمع کراؤ۔ اس پر عبداللہ تو خاموش ہی رہے لیکن عبیداللہ نے پھر اپنی بات رکھی۔ اس پر مجلس میں ایک شریک نے کہا کہ اے امیر المومنین آپ اس کو مضاربت بنا لیجئے (تا کہ امانت بھی رہے کیونکہ مال مضاربت مضارب کے پاس امانت ہوتا ہے اور عمل اور سرمایہ کا نفع بھی مل جائے)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (کو یہ بات پسند آئی اور انہوں نے) اصل مال اور نصف نفع لیا اور عبداللہ اور عبیداللہ نے نصف نفع لیا۔

اس قصہ سے معلوم ہوا کہ وہ رقم جو کسی کے پاس کسی منصب کی وجہ سے امانت ہو مثلاً حاکم ہو یا نابالغ کا ولی و وصی ہو یا وقف کا ناظم ہو اس کے لیے امانت کا مال کسی کو نفع کمانے کے لیے ادھار دینا درست نہیں۔ اور اگر دے دیا ہو تو اس کو مضاربت پر محمول کیا جائے گا تا کہ عمل کے ساتھ ساتھ سرمایہ کو بھی اپنے حصے کا نفع ملے۔

ہمارا یہ کہنا کہ یہ حکم مخصوص قسم کی امانت سے متعلق ہے حکم عام نہیں ہے اس کی تائید شرح مہذب کے اس حوالے سے بھی ہوتی ہے جو خود مولانا مدظلہ نے نقل کیا ہے۔ وہ یہ ہے

لانہ کان من الامور العامة ما یتسع حکمه عن العقود الخاصة (یہ معاملہ امور عامہ کا یعنی پبلک اور سرکاری معاملہ تھا جس کے حکم میں نجی عقود کے مقابلہ میں وسعت ہوتی ہے)۔ لیکن حیرت ہے کہ اتنی اہم خصوصیت کو نظر انداز کر کے مولانا مدظلہ مذکورہ بالا واقعہ کو عام نجی معاملات کی بنیاد بنا رہے ہیں۔

غرض مولانا مدظلہ کی ایسی غیر متعلق مثالوں سے کام نکالنے کی کوشش تعجب خیز ہے۔

باب:4

یومیہ پیداوار کے طریقے میں تعامل اور ضرورت ہونے کا جواب

مذکورہ بالا مثالیں دینے کے بعد مولانا مدظلہ لکھتے ہیں:

شرکت اور مضاربت میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جن میں اگر منطقی باریکیوں کا لحاظ کیا جائے تو وہ ناجائز قرار پائیں لیکن فقہاء کرام نے انہیں تعامل اور حاجت کے پیش نظر جائز قرار دیا ہے۔ (غیر سودی بینکاری ص 321)۔

''یہ (یعنی پچھلی چھ) مثالیں پیش کرنے کا منشاء یہ نہیں ہے کہ یہ صورتیں یومیہ پیداوار کے طریقے پر پوری طرح منطبق ہیں، بلکہ منشاء یہ ہے کہ فقہاء کرام رحمہ اللہ نے شرکت کی ایسی مختلف صورتوں کو عرف وتعامل اور حاجت کی بنیاد پر جائز قرار دیا ہے جن میں بظاہر ایک شخص دوسرے کے پیسے یا عمل یا وجاہت سے فائدہ اٹھا رہا ہے''۔ (غیر سودی بینکاری ص 323)۔

ہم کہتے ہیں

اپنی اس بات سے مولانا مدظلہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جیسے ان مثالوں میں ایک شخص دوسرے کے سرمائے یا عمل سے فائدہ اٹھاتا ہے جو کہ شرعی ضابطہ کے خلاف ہے لیکن محض

ضرورت وتعامل کی وجہ سے فقہاء نے ان صورتوں کو جائز قرار دیا ہے اسی طرح یومیہ پیداوار کا طریقہ بھی اگرچہ شرعی ضابطہ کے خلاف ہے کہ اس میں بھی ایک شخص دوسرے کے سرمائے سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن چونکہ بینکوں میں اس کا تعامل بھی ہے اور ضرورت بھی ہے اس لئے اس طریقہ کو بھی جائز قرار دینا چاہئے۔

ہم کہتے ہیں

فقہاء اگرچہ محض منطقی باریکیوں کا لحاظ نہیں کرتے لیکن اس کا لحاظ ضرور کرتے ہیں کہ شرعی ضابطے پامال نہ ہوں۔ اسی وجہ سے فقہاء نے مذکورہ مثالوں میں یہ واضح کرنے کا اہتمام کیا ہے کہ ایک شریک دوسرے کے سرمائے اور عمل سے فائدہ نہیں اٹھا رہا لیکن مولانا مدظلہ اس اہم حقیقت کو نظر انداز کر گئے ہیں۔

رہی بات ضرورت کی تو مولانا عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں

''لوگوں کو اس بات کا پابند کرنا کہ وہ کسی ایک خاص تاریخ میں بینک میں رقمیں رکھوائیں اور ایک ہی تاریخ میں نکالیں، تقریباً ناقابل عمل ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ اس خاص تاریخ کے علاوہ کسی اور دن کسی کو رقم رکھوانے کی ضرورت ہو تو وہ کرنٹ اکاؤنٹ ہی میں رکھوائے مضاربت کھاتے میں شریک نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسی تمام رقوم سے بینک تو نفع حاصل کرے لیکن ان رقوم کے مالکان کو کوئی نفع نہ ملے۔''

(غیر سودی بینکاری ص 304)

نیز فرماتے ہیں:

''اگر بینک کے ادارے کو سود سے پاک کر کے اس طرح تبدیل کرنا ہو کہ عام لوگوں کی بچتوں سے صرف بینک اور اُس سے تمویل حاصل کرنے والے سرمایہ دار ہی فائدہ نہ اٹھائیں، بلکہ وہ عوام جن کی رقمیں بینک میں جمع ہوتی ہیں، وہ بھی ان رقموں کے منافع سے مستفید ہو سکیں تو پھر یومیہ پیداوار

کے اس طریقے کے سوا جس کے فقہی جواز پر اوپر بحث کی گی ہے، کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" (غیر سودی بینکاری ص 333)۔

مولوی عمران اشرف عثمانی فرماتے ہیں:۔

"اگر یومیہ پیداوار کی بنیاد پر نفع کی تقسیم کو قبول نہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو کوئی شریک کوئی رقم نکلوا سکتا ہے اور نہ ہی مشترکہ فنڈ میں کوئی نئی رقم جمع کی جا سکتی ہے۔ اس طرح کسی کے لئے بھی ممکن نہ ہوگا کہ وہ مشترکہ فنڈ میں رقم جمع کرا سکے سوائے نئی میعاد کے شروع ہونے کی مقررہ تاریخوں میں۔ بینکوں اور مالیاتی اداروں میں بچت جمع کرانے کے اعتبار سے یہ طریقہ سرے سے نا قابل عمل ہے جہاں جمع کرانے والے ایک دن میں کئی کئی بار پیسے جمع کراتے ہیں اور نکلواتے ہیں۔ یومیہ پیداوار کے تصور کو رد کر دینے سے بچت کنندگان مجبور ہوں گے کہ کسی نفع بخش کھاتے میں فاضل سرمایہ جمع کرانے سے پہلے وہ مہینوں انتظار کریں۔ یہ بات صنعت وتجارت کی ترقی کے لئے بچتوں کے استعمال سے مانع ہوگی اور اس طرح سے مالیاتی جدوجہد کے پہیئے طویل مدتوں کے لئے بالکل جام ہوکر رہ جائیں گے"۔

(ترجمہ اقتباس از Meezan Bank`s Guide to Islamic Banking)

ان مذکورہ بالا عبارتوں کا حاصل یہ چند امور ہیں:

1- اس وقت یومیہ پیداوار کے طریقہ کار کا تعامل ہے اس وجہ سے لوگوں کو اس بات کا پابند کرنا کہ وہ کسی ایک خاص تاریخ میں بینک کے مضاربہ اکاؤنٹ میں رقمیں رکھوائیں اور ایک ہی تاریخ میں نکالیں تقریباً نا قابل عمل ہے۔

2- عوام کا اپنی جمع کردہ رقموں کے منافع سے مستفید ہونا اس طریقہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

3- اس کے بغیر مالیاتی جدوجہد کے پہیئے طویل مدتوں کے لئے بالکل جام ہوکر رہ جائیں گے اور ملکی صنعت وتجارت کی ترقی میں رکاوٹ ہوگی۔

ہم کہتے ہیں

i- ہم صنعت وتجارت کے موجودہ نظام کو نہ بھی چھیڑیں تب بھی رقمیں اگر کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی جائیں تو مالیاتی جدوجہد کا پہیہ تو چلتا رہے گا بس اتنا ہے کہ لوگوں کو ان رقموں پر نفع نہ ملے گا۔

ii- لوگوں نے اسلامی بینکوں کی طرف رجوع اس وجہ سے کرنا تھا کہ ان کا نظام شریعت کے مطابق ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ عبوری مدت کا نفع دیتے ہیں یا نہیں۔

iii- یومیہ پیداوار کا طریقہ پاکستان میں کم وبیش پچیس سال سے جاری ہوا ہے۔ اسلامی بینکوں نے تو تعامل کے برخلاف اپنا نظام دینا تھا۔ انقلابی کاموں کے لئے سابقہ تعامل کوئی رکاوٹ نہیں ہوا کرتا اور نہ ہی انقلابی کام اپنے مزاج کے مخالف کام سے سمجھوتہ کرتا ہے۔

iv- ہر تین ماہ بعد اگر مضاربہ اکاؤنٹ میں رقمیں جمع کرائی جائیں اور نکالی جائیں اور بینک اپنے حسابات سہ ماہی بنیاد پر کرے تو یہ کوئی بڑی مدت نہیں۔ طویل المیعاد سرمایہ کاری اس کے علاوہ ہوسکتی ہے۔

v- مولوی عمران اشرف عثمانی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر وہ لوگ زیادہ ہیں جو ایک دن میں کئی کئی بار رقمیں جمع کراتے ہیں اور نکلواتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طبقہ بڑے کاروباری لوگوں کا ہے جن کے لئے بینکوں میں روزمرہ کی رقم جمع کرانا ناگزیر ہے خواہ ان کو اس پر کچھ بھی نفع نہ ملے۔ یہ عام بچت کنندگان نہیں ہوتے۔

باب:5

یومیہ پیداوار کے طریقے کی رو سے مضاربہ اکاؤنٹ سے رقمیں نکلواتے رہنا

مولانا عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

''اب اس طریق کار کے دوسرے پہلو کی طرف آتے ہیں یعنی مختلف شرکاء کا شرکت و مضاربت شروع ہونے کے بعد رقمیں نکلوانا۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی رقم اس مشترک حوض سے نکلوانا چاہتا ہے وہ درحقیقت اپنا حصہ جزوی یا کلی طور پر دوسرے شرکاء کو فروخت کر دیتا ہے''۔

(غیر سودی بینکاری ص 327)

نیز لکھتے ہیں:

''بینکوں میں تمام شرکاء صرف اس مقصد کے لئے شریک ہوتے ہیں کہ وہ بینک سے اجتماعی طور پر مضاربت کریں۔ لہٰذا تمام سرمایہ مال مضاربت ہے۔ اور چونکہ یہ مال کاروبار میں لگ کر غیر نقد اثاثوں میں تبدیل ہو چکا ہے اس لئے بدائع کے بیان کردہ اصول کے مطابق صرف رب المال کے کہنے سے مضاربت ختم نہیں ہوگی۔ اب اگر دوسرے ارباب الاموال خود یہ طے کر لیتے ہیں کہ کسی اور کو بیچنے کے بجائے ایسے موقع پر وہ خود اس کا حصہ خرید لیں

گے تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے؟

(غیر سودی بینکاری ص 331)

مولانا عثمانی مدظلہ مزید لکھتے ہیں:

یہ بات عقلی طور پر بھی بالکل ظاہر ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے بینکاری کے مسئلے کو ایک طرف رکھ دیجئے، اور فرض کیجئے کہ بیس آدمی مل کر ایک کپڑا بنانے کا کارخانہ قائم کرنے کے لئے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں، اور اس سرمائے سے مشینری اور خام مال خرید لیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک شریک شرکت کو فسخ کر دیتا ہے۔ اب اگر وہ شریک یہ مطالبہ کرے کہ یا تو مشینری اور خام مال تقسیم کر کے مجھے دو، یا اس مشین اور خام مال کو بازار میں بیچو اور قیمت میں سے حصہ رسدی مجھے ادا کرو تو باقی انیس شرکاء پر کیا گزرے گی؟ چلئے کسی طرح مشینری اور خام مال بیچ دیا گیا اور انہوں نے دوبارہ مشینری خرید کر کاروبار شروع کر دیا، ابھی کاروبار شروع ہوا ہی تھا، کہ کچھ کپڑا تیار ہو کر فروخت ہوا تھا، کچھ قیمت آ چکی تھی، کچھ خریداروں کے ذمے باقی تھی کہ اتنے میں ایک دوسرے شریک نے شرکت فسخ کر دی اور مطالبہ کیا کہ تمام اثاثے ابھی تقسیم کئے جائیں۔

غرض اگر ہر تھوڑے وقفے کے بعد کوئی ایک شریک اثاثوں کی تقسیم یا سارے اثاثے فوراً بازار میں بیچنے کا مطالبہ کر کے سارا کاروبار ٹھپ کرتا رہے تو تجارت کیسے چلے گی؟ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے اگر تمام شرکاء شروع میں ہی یہ طے کر لیں کہ کسی شریک کے فسخ کرنے کی صورت میں نہ اثاثے تقسیم کئے جائیں گے اور نہ اثاثوں کو بازار میں بیچا جائے گا، البتہ امام طحاوی رحمہ اللہ کے بیان کئے ہوئے مذکورہ بالا اصول کے تحت باقی شرکاء نکلنے والے شریک کا حصہ خرید لیں گے تو خاص طور پر آج کی تجارت وصنعت میں

اس کے سوا کوئی اور صورت قابل عمل نہیں ہے اور اس سے کسی شرعی اصول کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی۔ (غیر سودی بینکاری ص 332)

پھر آخر میں مولانا مدظلہ لکھتے ہیں:

''انہیں باتوں کے پیش نظر اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی رپورٹ میں یہ طریقہ اس وقت باتفاق تجویز کیا جب اُس میں حضرت مولانا شمس الحق افغانی اور حضرت مفتی سیاح الدین کاکاخیل رحمہما اللہ تعالیٰ جیسے اکابر موجود تھے، اور پھر مجلس تحقیق مسائل حاضرہ میں بھی اکاؤنٹ سے رقمیں نکالنے کو جائز قرار دیا گیا، (احسن الفتاوی ج 7 ص 122) اور حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم نے جن تین باتوں سے اختلاف فرمایا تھا، ان میں یہ بات شامل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ عالم اسلام میں جہاں جہاں غیر سودی بینک قائم ہوئے، وہاں کے علماء نے اسی کو جائز اور قابل عمل طریقہ قرار دیا ہے۔'' (غیر سودی بینکاری ص 333)

ہم کہتے ہیں

مولانا عثمانی مدظلہ نے کھلے مضاربہ اکاؤنٹ میں سے رقمیں نکلوانے کی جو تفصیل و توجیہ لکھی ہے وہ اسلامی بینکوں پر بالکل بھی منطبق نہیں ہوتی۔

i- جو لوگ مضاربہ اکاؤنٹ کھلواتے ہیں ان کا آپس میں یہ طے کرنا کب ہوتا ہے کہ وہ کسی اکاؤنٹ ہولڈر کے اپنی رقم نکلوانے کی صورت میں اس کا حصہ خرید لیں گے۔

ii- کیا دیگر شرکاء ہر بار اپنے پاس سے اتنی رقم بینک میں جمع کراتے ہیں جو ایک شریک نے نکلوائی ہے۔ پھر اس کی حد کیا ہوگی؟ اگر بیس شرکاء نے برابر کی رقم ملا کر دو کروڑ روپیہ بینک کے مضاربہ اکاؤنٹ میں جمع کرایا جس سے کام شروع ہوا۔ پھر دس شرکاء نے اپنی رقمیں نکلوا لیں تو کیا باقی دس شرکاء پابند ہوں گے کہ وہ ایک کروڑ روپیہ مزید فراہم کریں۔ ہاں یہ تو ہوسکتا ہے کہ بینک اپنے فاضل ذاتی سرمائے سے وہ حصے خرید لے لیکن

مولانا مدظلہ تو تصریح فرماتے ہیں کہ وہ حصے باقی شرکاء ہی خریدتے ہیں:

بینکوں میں تمام شرکاء صرف اس مقصد کے لئے شریک ہوتے ہیں کہ وہ بینک سے اجتماعی طور پر مضاربت کریں۔ لہٰذا تمام سرمایہ مال مضاربت ہے۔ اور چونکہ یہ مال کاروبار میں لگ کر غیر نقد اثاثوں میں تبدیل ہو چکا ہے اس لئے بدائع کے بیان کردہ اصول کے مطابق صرف رب المال کے کہنے سے مضاربت ختم نہیں ہوگی۔ اب اگر دوسرے ارباب الاموال خود یہ طے کر لیتے ہیں کہ کسی اور کو بیچنے کے بجائے ایسے موقع پر وہ خود اس کا حصہ خرید لیں گے تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے؟''

(غیر سودی بینکاری ص 331)

iii- پیچھے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یومیہ پیداوار کا طریقہ اصولی طور پر ہی ناجائز ہے لہٰذا اس کے بعد رقم نکلوانے کے جواز کی بحث بے فائدہ ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے یومیہ پیداوار کے بارے میں اپنی رپورٹ میں اگر وہی کچھ کہا ہے جو مولانا عثمانی مدظلہ نے اپنے استدلال میں ذکر کیا ہے تو ہم اس کا جائزہ لے چکے ہیں۔

رہی مولانا مدظلہ کی یہ بات کہ مجلس تحقیق مسائل حاضرہ میں بھی اکاؤنٹ سے رقمیں نکالنے کو جائز قرار دیا گیا اور میں نے (یعنی عبدالواحد نے) اس سے اختلاف نہیں کیا تو اس کے دو جواب ہیں:

1- اس کا یومیہ پیداوار کے طریقہ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

2- مجلس تحقیق کی بات اس سے بہت مختلف ہے جو مولانا مدظلہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

مجلس تحقیق کی متعلقہ عبارت یہ ہے۔

''فرض کریں کہ یکم جنوری کو روئی کی ایک ہزار گانٹھیں مرابحہ کے طریق کار کے تحت عمیل نے بینک سے خریدیں اور اس پر شرح منافع لاگت پر 15

فیصد لگائی گئی اور اس معاملے کے تحت عمیل پر مثلاً ایک لاکھ روپے واجب الادا ہو گئے لیکن کسی وجہ سے عمیل یہ چاہتا ہے کہ وہ پچاس ہزار روپے ابھی ادا کر دے تو اس کا ایک ''خصوصی اکاؤنٹ'' بینک میں کھول دیا جائے گا جس پر اسے دوسرے اکاؤنٹ ہولڈروں کی طرح منافع دیا جائے گا......

اس اکاؤنٹ سے عمیل وقتاً فوقتاً اپنی رقمیں نکال بھی سکے گا جس کا طریق کار یہ ہوگا:

''اس نے اپنی واجب الادا رقم مثلاً ایک لاکھ روپے کی ضمانت کے لئے جو رہن رکھا ہوا ہے مثلاً سوت یا روئی ہی کی گانٹھیں، جب وہ اسے یا اس کے کچھ حصے کو چھڑانا چاہے تو جتنا حصہ چھڑانا چاہتا ہے اس کی قیمت کا خصوصی اکاؤنٹ کھول دے۔

یہ قیمت کی جزوی ادائیگی تصور نہ ہوگی بلکہ ایک نیا اکاؤنٹ کھولنا ہوگا جس پر بینک تبرعاً اتنا حصہ واپس کر دے گا۔ اب وہ اس اکاؤنٹ سے اتنی رقم نکلوا سکے گا جس کے نکلوانے کے بعد اس کے اکاؤنٹ میں باقی رہنے والی رقم باقی ماندہ رہن کے ساتھ مل کر واجب الاداء قیمت کے برابر ہو۔

اسی طرح 31 دسمبر تک مختلف معاملات رہیں گے یہاں تک کہ 31 دسمبر کو تمام معاملات کی مجموعی قیمت کی ادائیگی مکمل ہونے پر یہ خصوصی اکاؤنٹ ختم ہو جائے گا۔ (احسن الفتاوی ج 7 ص 123,122)

اس تفصیل کے مطابق عمیل جتنی رقم جمع کرائے گا صرف اس کے بقدر بینک رہن کا حصہ چھوڑتا رہے گا۔ اب عمیل اس اکاؤنٹ میں سے صرف ملنے والا نفع ہی نکلوا سکتا ہے کیونکہ اصل رقم کے عوض وہ اس کے بقدر رہن چھڑوا چکا ہے۔ لہذا یہ بات اس سے بہت مختلف ہے جو مولانا عثمانی مدظلہ ثابت کرنا چاہتے ہیں (یعنی یہ کہ یومیہ پیداوار کے طریقے میں مضاربہ کے کھاتہ سے اکاؤنٹ ہولڈر وقتاً فوقتاً رقمیں نکلوا سکتے ہیں)۔

باب:6

کمپنی کی حقیقت کیا ہے؟

''کیا شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے؟''۔اس عنوان کے تحت ہم نے لکھا تھا۔

(کمپنی کا معاملہ) اولا شرکت املاک ہے اور پھر عقد اجارہ ہے۔اس کی وضاحت یہ ہے کہ حصص کے خریدار اور ابتدائی سرمایہ کار اپنے مال ملا کر اکٹھا کر لیتے ہیں اور یوں ان کے مال میں شرکت قائم ہو جاتی ہے۔پھر ڈائرکٹرز کا چناؤ کیا جاتا ہے جو اجرت اور بھتوں کے عوض میں اس مشترکہ سرمایہ پر کام کرتے ہیں اور نفع کو ہر ایک کے سرمایہ کے تناسب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے یہ شرکت املاک کے بعد شرکت عقد نہیں ہے اجارہ ہے۔ (جدید معاشی مسائل ص59)

اس پر مولانا تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

''لیکن حقیقت یہ ہے کہ کمپنی کے عقد کو بنیادی طور پر عقد اجارہ قرار دینا ایسی عجیب بات ہے کہ اس پر حیرت کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے؟ کمپنی کی شرعی حیثیت پر اب تک بہت سی کتابیں اور تحریریں آئی ہیں، کسی نے بھی آج تک اس کو اجارہ قرار نہیں دیا۔ پھر حضرت مفتی (عبدالواحد) صاحب مدظلہم نے بھی اس بارے میں مختلف عبارتیں استعمال فرمائی ہیں۔ صفحہ 55 پر تو فرمایا کہ ''اگرچہ عرف عام میں اس کو شرکت کہا جاتا ہے، لیکن شرعی نقطہ نظر سے یہ معاملہ شراکت کا نہیں، بلکہ اجارہ کا ہے،۔ نیز 67 پر فرمایا کہ:''وہ عقد (یعنی

کمپنی) شرکت عنان نہیں، اجارہ ہے''۔ ان دونوں جگہوں پر شراکت کی بالکل ہی نفی فرمادی ہے۔ لیکن صفحہ 59 پر فرمایا کہ: ''اولاً شرکت املاک ہے، اور پھر عقد اجارہ ہے''۔ اور صفحہ 69 پر فرمایا کہ حصص کی خرید کے ساتھ اجارہ اقتضاء منعقد ہوتا ہے۔'' (غیر سودی بینکاری ص: 346,347)

ہم کہتے ہیں

مولانا مدظلہ نے ہماری عبارتوں کے اختلاف کی طرف نشاندہی کی ہے یہ محض لفظی اختلاف ہے حقیقی نہیں اور ہم نہیں سمجھتے کہ اہل علم کو پوری بات پڑھ کر یہاں کچھ بھی اشکال ہو۔ لیکن مولانا مدظلہ نے چونکہ اس کو ذکر کر دیا ہے تو ہم وضاحت کرتے ہیں:

ص 55 کی عبارت یوں ہے:

''اگرچہ عرف عام میں اس کو شرکت (عنان) کہا جاتا ہے لیکن شرعی نقطہ نظر سے یہ معاملہ شرکت (عنان) کا نہیں بلکہ اجارہ کا ہے۔''

ص 67 کی عبارت یوں ہے:

''وہ عقد (یعنی کمپنی) شرکت عنان نہیں اجارہ ہے۔''

ص 59 کی عبارت کا مطلب واضح ہے:

''اولاً شرکت املاک ہے اور پھر عقد اجارہ ہے۔''

ص 69 کی عبارت کا مطلب ہے:

جب ایک شخص کمپنی کے حصص خریدتا ہے تو بظاہر یہ حصص کی خرید ہے لیکن درحقیقت وہ اپنا مال ملا کر کمپنی کے کارکنوں کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرتا ہے کہ وہ اس کے مال سے کاروبار کریں اور اس سے اس پر اجرت لیں اور اس کے مال پر ہونے والا نفع اس کو دیں۔

کمپنی کا معاملہ اجارہ کیسے ہے؟

رہا ہمارے کمپنی کے عقد کو عقد اجارہ کہنے پر مولانا مدظلہ کا حیرت کرنا تو ہمیں خود حیرت ہے کہ ہماری بات کیوں مولانا مدظلہ کی سمجھ میں نہ آئی۔

مولانا مدظلہ آگے لکھتے ہیں:

''دراصل جو بات حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے ذہن میں ہے، وہ یہ ہے کہ کمپنی کو اس کے ڈائریکٹران چلاتے ہیں، اور اس پر تنخواہ بھی وصول کرتے ہیں، وہ شرکاء کے اجیر ہوتے ہیں، اس لئے شرکاء کے ساتھ ان کا عقد اجارے کا ہوتا ہے۔ لیکن کمپنیز آرڈی ننس کے مطالعے اور کمپنیوں کے عملی طریق کار سے جو بات واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ابتدائی طور پر سرمایہ جمع کر کے عام لوگوں کو کاروبار میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں، اس دعوت کے لئے جو لٹریچر لوگوں کو مہیا کیا جاتا ہے، ان میں ان لوگوں کے نام بہ حیثیت ڈائریکٹر درج ہوتے ہیں، لیکن وہ کمپنی کے ملازم نہیں ہوتے، اور نہ ان کو تنخواہ دی جاتی ہے، بلکہ وہ شرکاء کے وکیل کی حیثیت میں کاروبار کی پالیسی طے کرتے ہیں۔ تمام کمپنیوں میں عمل اس پر ہے کہ ڈائریکٹر کو صرف ڈائریکٹر ہونے کی بناء پر کوئی تنخواہ نہیں دی جاتی، بلکہ میٹنگ میں شرکت کی فیس دی جاتی ہے، اور بعض کمپنیوں میں وہ بھی نہیں ہوتی، بلکہ ڈائریکٹر دوسرے حصہ داروں کی طرح صرف نفع میں شریک ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی ڈائریکٹر کمپنی کا کوئی کام ہمہ وقتی طور پر سنبھال لے تو اس کو تنخواہ دی جاتی ہے۔ ڈائریکٹروں کا بورڈ درحقیقت کمپنی چلانے کے لئے ایک چیف ایگزیکٹو (ناظم اعلیٰ) کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ چیف ایگزیکٹو عموماً ابتدائی ڈائریکٹروں میں سے نہیں ہوتا، بلکہ باہر سے لیا جاتا ہے، لیکن چیف ایگزیکٹو بننے کے بعد اسے بھی بہ لحاظ عہدہ ڈائریکٹر سمجھا جاتا ہے۔ البتہ کبھی ڈائریکٹروں میں سے بھی کسی کو چیف ایگزیکٹو بنا دیا جاتا ہے، اور کبھی چیف ایگزیکٹو کے علاوہ کسی اور ڈائریکٹر کو بھی کمپنی کے کام میں کوئی ہمہ وقتی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے، ایسے ڈائریکٹر کو ایگزیکٹو ڈائریکٹر کہا جاتا ہے، اور پھر وہ تنخواہ بہ حیثیت ڈائریکٹر نہیں، بلکہ

بحیثیت ملازم وصول کرتا ہے، اوراس صورت میں وہ میٹنگ میں شرکت کی اس فیس کا بھی حق دار نہیں رہتا جو عام ڈائریکٹروں کو ملتی ہے۔ لیکن تنخواہ دار ایگزیکٹو کے تقرر سے متعلق سارے کام کمپنی کے قیام کے بعد عمل میں آتے ہیں، کمپنی کے قیام کا حصہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ کمپنیز آرڈیننس کی دفعہ 198 اور دفعہ 200 میں یہ مذکور ہے:

198. (2) The directors of every company shall as from the date from which it commences business, or as from a date not later than the fifteenth day after the date of its incorporation, whichever is earlier, appoint any individual to be the chief executive of the company.

(3) The chief executive appointed as aforesaid shall, unless he earlier resigns or otherwise ceases to hold office, hold office up to the first annual general meeting of the company or, if a shorter period is fixed by the directors as the time of his appointment, for such period.

200. (2) The chief executive shall, if he is not already a director of the company, be deemed to be its director and be entitled to

all the rights and privileges, and subject to all the liabilities, of that office.

(The Companies Ordinance, 1984, p130)

حضرت مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم نے صفحہ 62 پر ڈائریکٹروں کے ملازم ہونے کی تائید میں ایک کمپنی کی سالانہ رپورٹ کے حوالے سے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس کے چیف ایگزیکٹو کو لاکھوں روپے کی تنخواہ دی گئی۔ حضرت مفتی صاحب نے اس سے یہ سمجھا کہ چیف ایگزیکٹو بھی اُن ڈائریکٹروں میں شامل ہوگا جو ابتدائی طور پر کمپنی قائم کرنے کا اعلان کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت اوپر عرض کی جا چکی ہے کہ چیف ایگزیکٹو کا تقرر کمپنی کے قیام کے بعد عمل میں آتا ہے، اور بہت سی صورتوں میں وہ مؤسس ڈائریکٹروں میں سے نہیں ہوتا، بلکہ باہر سے لیا جاتا ہے، اور صرف بہ لحاظ عہدہ ڈائریکٹر سمجھا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ سارے کام کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد ہوتے ہیں، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے چند شرکاء عقد شرکت کرتے ہوئے یہ بھی طے کر لیں کہ ہم کچھ لوگوں کو ملازم رکھ کر اُن کے ذریعے کام کریں گے۔ محض اس ارادے کے اظہار سے شرکت کا عقد اجارے میں تبدیل نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا اس کے ساتھ منعقد ہونے والے اجارے کو کمپنی کے قیام کا بنیادی عقد قرار دینا کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔

پھر مجھ جیسا کم علم یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہے کہ حضرت مفتی صاحب مدظلہم اس شرکت کو شرکت عقد کے بجائے شرکت ملک قرار دینے پر کیوں مصر ہیں جب کہ تمام شرکاء اس شرکت کے ذریعے نفع بخش کارربار کرنے پر متفق ہیں، اور اسی غرض کے لئے رقمیں جمع کر کے مؤسس شرکاء کو اس کاروبار میں اپنا وکیل بنا رہے ہیں، جب کہ شرکت ملک میں ہر شریک اپنے حصے میں دوسرے کے

لئے اجنبی ہوتا ہے۔ یہ بات تمام کتب فقہ میں موجود ہے، لیکن شیخ مصطفیٰ الزرقاء رحمہ اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کی شرکتوں کا فرق زیادہ واضح طریقے سے بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"إن الملكية الشائعة إنما تكون دائما فی شیئ مشترک فهذه الشركة إذا كانت فی عین المال فقط دون الاتفاق على استثماره بعمل مشترک تسمی شرکة ملک. و تقابلها شركة العقد، وهی أن یتعاقد شخصان فأكثر على استثمار المال أو العمل و اقتسام الربح كما فی الشركات التجارية و الصناعية. (المدخل الفقهی العام ج1 ص 263)

اور ایک دوسرے موقع پر انہوں نے مزید وضاحت اس طرح کی ہے:

"عقد الشركة: و هو عقد بین شخصین فأكثر على التعاون فی عمل اكتسابی و اقتسام أرباحه: والشركة فی ذاتها قد تكون شرکة ملک مشترک بین عدة أشخاص ناشئة عن سبب طبیعی كالإرث مثلا، وقد تكون شركة عقد بأن یتعاقد جماعة على القيام بعمل استثماری یتساعدون فیه بالمال أو بالعمل و یشترکون فی نتائجه. فشركة الملک هی من قبیل الملک الشائع، ولیست من العقود، وإن كان سببها قد یكون عقدا كمالو اشتری شخصان شیئا فإنه یكون مشتركا بینهما شركة ملک ولكن لیس بینهما عقد على استغلاله و استثماره بتجارة أو إجارة و نحو ذلک من وسائل الاسترباح. وأما شركة العقد التی غایتها الاستثمار والاسترباح فهی المقصودة هنا، والمعدودة من أصناف العقود المسماة." (المدخل الفقهی العام ج 1 ص

551) (غیر سودی بینکاری ص: 347 تا 351)

ہم کہتے ہیں

بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ کمپنی کے ڈائریکٹر جب کاروبار کرنے اور نفع کمانے کے لیے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں تو شرکت عقد یعنی شرکت عنان کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب اس کے ساتھ شرکت عنان کے منافی امور بھی پائے جائیں جو اس شرکت کو باطل کرتے ہوں تو پھر بھی اس کو شرکت عنان کہے چلے جانا درست نہیں۔

لیکن مولانا عثمانی مدظلہ کا یہ خیال ہے کہ شرکت عنان ایک دفعہ ثابت اور واقع ہو جائے، پھر خواہ کچھ بھی ہو جائے آئندہ وہ شرکت عنان ہی رہے گی۔ اس کو مولانا مدظلہ نے ایک معصوم سی مثال سے سمجھایا کہ جیسے چند شرکاء عقد شرکت کرتے ہوئے یہ بھی طے کر لیں کہ ہم کچھ لوگوں کو ملازم رکھ کر ان کے ذریعے کام کریں گے۔ محض اس ارادے کے اظہار سے شرکت کا عقد اجارے میں تبدیل نہیں ہو جاتا۔

اس معصوم سی مثال سے ہمیں بھی اختلاف نہیں لیکن اگر یہی مثال کچھ بدل کر یوں لی جائے کہ چند شرکاء عقد شرکت کرتے ہوئے یہ بھی طے کر لیں کہ وہ خود کام کریں گے اور اس پر تنخواہ بھی لیں گے یا یہ کہ وہ کم از کم میٹنگ کی فیس لیں گے تو کیا پھر بھی شرکت باقی رہے گی باطل نہ ہو گی۔

ہماری بتائی ہوئی مثال سے شرکت عنان کے باطل ہونے کا جو تصور و تاثر پیدا ہوتا ہے اس کو زائل کرنے کے لیے مولانا مدظلہ ایک خاص اسلوب سے یوں لکھتے ہیں:

''تمام کمپنیوں میں عمل اس پر ہے کہ ڈائرکٹر کو صرف ڈائرکٹر ہونے کی بناء پر تنخواہ نہیں دی جاتی بلکہ میٹنگ میں شرکت کی فیس دی جاتی ہے اور بعض کمپنیوں میں وہ بھی نہیں ہوتی، بلکہ ڈائریکٹر دوسرے حصہ داروں کی طرح صرف نفع میں شریک ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی ڈائریکٹر کمپنی کا کوئی کام ہمہ وقتی طور پر سنبھال لے تو اس کو تنخواہ دی جاتی ہے۔ ڈائریکٹروں کا بورڈ درحقیقت کمپنی چلانے کے لیے ایک چیف ایگزیکٹو (ناظم اعلیٰ) کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ

چیف ایگزیکٹو عموماً ابتدائی ڈائرکٹروں میں سے نہیں ہوتا بلکہ باہر سے لیا جاتا ہے......البتہ کبھی ڈائرکٹروں میں سے بھی کسی کو چیف ایگزیکٹو بنا دیا جاتا ہے، اور کبھی چیف ایگزیکٹو کے علاوہ کسی اور ڈائریکٹر کو بھی کمپنی کے کام میں کوئی ہمہ وقتی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے، ایسے ڈائریکٹر کو ایگزیکٹو ڈائریکٹر کہا جاتا ہے، اور پھر وہ تنخواہ بہ حیثیت ڈائریکٹر نہیں بلکہ بحیثیت ملازم وصول کرتا ہے، اور اس صورت میں وہ میٹنگ میں شرکت کی اس فیس کا بھی حق دار نہیں رہتا جو عام ڈائریکٹروں کو ملتی ہے''۔

ہم کہتے ہیں

اوپر جو بات ہم نے اجمال سے ذکر کی اس کی تفصیل یہ ہے:

شرکت عنان کے شریک کے لئے تنخواہ مقرر کرنا ایسے ہی ہے جیسے اس کے لئے نفع کی تقسیم سے قبل متعین رقم مخصوص کرنا۔

مجلّہ کے مادہ 1337 میں ہے۔

کون حصص الربح التی تنقسم بین الشرکاء کالنصف و الثلث و الربع جزء ا شائعا شرط فاذا تقاول الشرکاء علی اعطاء احدهم کذا غرشا مقطوعا تکون الشرکة باطلة.

(ترجمہ: نفع کے حصے جو شریکوں کے مابین تقسیم ہونے ہیں جیسے نصف، تہائی اور چوتھائی وغیرہ ان کا جز وشائع ہونا شرط ہے۔ لہٰذا اگر شریک اس پر اتفاق کر لیں کہ ان میں سے ایک کو اتنی رقم ملے گی تو شرکت باطل ہو جاتی ہے۔)

شرح مجلّہ میں ہے:

لان هذا شرط یوجب انقطاع الشرکة فی بعض الوجوه فلعله لا یخرج الا القدر المسمی لاحدهما و نظیره فی المزارعة اذا اشترطا لاحدهما قفزانا مسماة بحر قال فی رد المحتار و بیان القطع ان اشتراط عشرة دراهم مثلا من الربح لا حدهما یستلزم اشتراط جمیع الربح و ذلک یقطعها فتخرج

الی القرض او البضاعة کما فی الفتح اه و حیث کانت علة الفساد ھی القطع المذکور فلا یرد ان الشرکة لا تبطل بالشرط الفاسد فکان ینبغی ان یبطل الشرط دونھا. (شرح المجلہ ص 260 ج 4).

(ترجمہ: شرکت کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ شرط بعض صورتوں میں اس کو شرکت نہیں رہنے دیتی کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کل نفع صرف اتنی مقدار میں ہوا ہو جو ایک کے لئے طے ہوئی ہے (یا جو شریک نے اجرت میں رکھ لی ہے......از ناقل)۔ مزارعت میں اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک کے لئے متعین وزن کی پیداوار مخصوص کی جائے۔ ردالمحتار میں ہے: شرکت باقی نہ رہنے کا بیان یہ ہے کہ جب ایک شریک کے لئے نفع میں سے ایک ہزار روپے کی شرط کی تو اس صورت میں کہ نفع صرف ایک ہزار روپیہ ہوا ہو لازم آئے گا کہ پورا نفع اسی کا ہو حالانکہ شرکت کا تقاضا ہے کہ نفع مشترک ہو۔ اور تمام نفع ایک کا ہونا شرکت کو ختم کر کے معاملہ کو قرض یا بضاعت بنا دیتا ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے اھ اور جب شرکت کے فساد کے علت اس کا ختم ہو جانا ہے تو یہ اعتراض بھی نہیں پڑتا کہ شرط فاسد سے شرکت باطل نہیں ہوتی اور ضروری ہے کہ خود شرط باطل ہو جائے شرکت باطل نہ ہو۔)

درمختار میں ہے:

وبشرط الشرکة فی الخارج ثم فرع علی الاخیر بقولہ فتبطل ان شرط لاحدھما قفزان مسماة او ما یخرج من موضع معین او رفع رب البذر بذرہ او رفع الخراج الموظف و تنصیف الباقی بعد رفعہ.

(ترجمہ: مزارعت میں پیداوار میں شرکت شرط ہے لہٰذا اگر زمین والے اور مزارع میں سے کسی ایک کے لئے پیداوار کا ایک خاص وزن مقرر کیا یا کسی خاص جگہ کی پیداوار طے کی یا یہ شرط کی کہ بیج والے کا اپنے بیج کی مقدار لینے کے بعد یا خراج موظف نکالنے کے بعد باقی پیداوار دونوں میں نصف نصف تقسیم ہوگی تو یہ مزارعت باطل ہو جائے گی۔)

غرض شرکت عنان تو پہلے ہی مرحلہ میں باطل ہو جاتی ہے اور جیسا کہ آگے آئے گا

شرکت ملک بن کر رہ جاتی ہے۔ایسی صورت میں عقد و معاملہ کو کسی دوسرے طور سے صحیح کرنا پڑے گا۔اس کا حل ہم نے یہ ڈھونڈھا کہ عقد کو بجائے شرکت عنان کے اجارہ بنا دیا جائے۔

البتہ کوئی کہے کہ شرکت عنان کے منعقد ہونے کے وقت تو یہ طے نہیں ہوتا کہ ڈائریکٹر کام کریں گے یا نہیں۔ یہ تو بعد میں طے ہوتا ہے اور جو باطل ہے وہ وہ ہے جس میں شرکت کرتے ہوئے یہ شرط کی جائے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا عبارتیں اس پر دال ہیں کہ یہ شرط جب بھی لگائی جائے خواہ مال اکٹھا کرتے ہوئے یا بعد میں وہ شرکت کو ختم کر دیتی ہے کیونکہ ان عبارتوں میں شرط کو مطلق ذکر کیا ہے مقارنت کی قید کے ساتھ نہیں جیسے **لان ھذا شرط یوجب انقطاع الشرکۃ.**

تنبیہ: یہ بات پیش نظر رہے کہ ہماری ذکر کردہ تاویل صرف پبلک کمپنیوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان تمام پرائیویٹ کمپنیوں اور دکانوں کی ضرورت بھی ہے جن میں سلیپنگ پارٹنر بھی ہوتے ہیں اور عامل شریک نفع کے علاوہ تنخواہ بھی لیتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ یہ اجارہ پھر کسی شرط فاسد سے فاسد ہو جائے۔

درمختار میں ہے

و تفسد باشتراط دراھم مسماۃ من الربح لاحدھما لقطع الشرکۃ کمامر لا لانہ شرط...... و یکون الربح علی قدر المال.

(ترجمہ: کسی ایک شریک کے لیے متعین رقم شرط کرنے سے شرکت فاسد ہو جاتی ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ شرط فاسد ہے بلکہ اس وجہ سے کہ شرکت کی حقیقت ہی ختم ہو جاتی ہے۔)

اس پر علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ای و ان اشترط فیہ التفاضل لان الشرکۃ لما فسدت صار المال

مشترکا شرکة ملکٔ و الربح فی شرکة الملک علی قدر المال.

(ترجمہ: اگرچہ نفع میں تفاضل کی شرط کی گئی ہو کیونکہ شرکت جب فاسد ہو جاتی ہے تو مشترک مال شرکت املاک کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور شرکت املاک میں نفع بقدر مال (ملک) ہوتا ہے۔)

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شریک جو اجرت لیتا ہے وہ نفع اور کمائی ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

کیا شرکت عنان کے شریک کو شرکت کے کام پر اجرت لینا جائز ہے؟

ہم کہتے ہیں

ہماری ذکر کردہ وجہ کے ایک اور جواب کے طور پر مولانا عثمانی مدظلہ نے اپنی سابقہ بات کو دہرا دیا ہے کہ:

"اگر یہ چیف ایگزیکٹو کمپنی کا حصہ دار بھی ہو تو اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ شریک اجیر نہیں بن سکتا، لیکن اس مسئلے پر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مفصل فتویٰ تحریر فرمایا ہے جس میں مضبوط دلائل سے شریک کے اجیر بننے کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ (دیکھئے احسن الفتاوی ج 7 ص 321 تا 328، یہاں اس کا حوالہ کافی ہے)۔ (غیر سودی بینکاری حاشیہ ص 348)۔

لیکن مولانا مدظلہ نے اس پر غور نہیں کیا کہ مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کا جواب احسن الفتاوی میں کیئے گئے سوال سے اور خود مولانا عثمانی مدظلہ کے دعوے سے مطابقت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ کیا گیا سوال اور مولانا عثمانی مدظلہ کا دعویٰ بھی شرکت عنان کے شریک کو اجیر رکھنے کے بارے میں ہے جب کہ مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کا جواب شرکت املاک میں شریک کے لئے جاری ہوتا ہے شرکت عنان کے شریک میں نہیں۔ لیکن افسوس ہماری یہ بات مولانا مدظلہ کی توجہ کو نہ کھینچ سکی۔

ہم نے اپنی کتاب میں مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کے دئے ہوئے یہ حوالے بھی نقل کئے تھے جو شرکت املاک کے شریک کو اجیر رکھنے پر واضح دلیل ہیں:

قال الامام الحصکفی رحمه الله تعالیٰ ولو استاجره لحمل طعام مشترک بینهما فلا اجر له (ص 321 احسن الفتاوی، ج 7)

(ترجمہ: امام حصکفی رحمہ اللہ نے فرمایا اگر ایک شریک نے دوسرے کو ان کے درمیان مشترکہ غلہ اٹھا لے جانے کے لئے اجرت پر رکھا تو دوسرے کو کچھ اجرت نہ ملے گی۔)

قال الامام المرغینانی رحمه الله استاجره لیحمل نصف طعامه بالنصف الآخر حیث لا یجب الاجر لان المستاجر ملک الاجر فی الحال بالتعجیل فصار مشترکا بینها و من استاجر رجلا لحمل طعام مشترک بینهما لا یجب الاجر لان ما من جزء یحمله الاو هو عامل لنفسه (احسن الفتاوی ص 322 ج 7)

(ترجمہ: امام مرغینانی رحمہ اللہ نے کہا ایک شخص نے دوسرے کو اجرت پر رکھا تا کہ وہ اس کے نصف غلہ کو بقیہ نصف غلہ کے عوض میں اٹھا کر اس کے گھر پہنچا دے تو مزدور کو کچھ اجرت نہ ملے گی کیونکہ ایڈوانس اجرت کی وجہ سے مزدور اجرت کا فی الحال مالک بن گیا ہے اور غلہ دونوں کے درمیان مشترک ہو گیا ہے۔ اور جو کوئی آپس کے مشترکہ غلہ کو اٹھا کر لے جانے کے لیے شریک کو اجرت پر لے تو اجرت واجب نہیں ہوتی کیونکہ (غلہ کی تقسیم سے پہلے) شریک غلہ کا جو دانہ بھی اٹھا کر لے جائے گا اس میں وہ اپنے لیے عمل کرنے والا ہوگا۔)

کیا پھر بھی کمپنی شرکت عقد ہے؟

لیکن مولانا مدظلہ نے ہماری بہت سی ایسی باتوں کو قابل التفات ہی نہیں سمجھا اور اپنی اس بات پر کہ کمپنی شرکت عنان ہے اور شرکت ہی رہتی ہے مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی اس

بات کو حجت بنا لیا کہ ''اپنی حقیقی روح کے اعتبار سے کمپنی شرکت عنان میں داخل ہے''۔ اور اس کی تائید مولانا مدظلہ نے شیخ مصطفیٰ زرقاء رحمہ اللہ کے حوالوں سے حاصل کی کہ جب کمائی کے لیے روپیہ اکٹھا کیا تو یہ شرکت عقد ہوتی ہے۔

ہم کہتے ہیں

کمپنی میں اگر شرکت عنان کی حقیقی روح ہوتی تو اس کی خصوصیات بھی اس میں پائی جاتیں۔ یہ روح کوئی ایسی چیز نہیں جو کشف وغیرہ سے معلوم ہو سکے۔ اس کے وجود کا علم تو اس کی خصوصیات سے ہوگا اور شرکت عنان کی خصوصیات سے کمپنی کو مولانا مدظلہ خالی مانتے ہیں اور اسی وجہ سے لکھتے ہیں: ''کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں ان کے لحاظ سے کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں سے کسی میں داخل نہیں۔''

غرض مذکورہ بالا وجہ ہمارے لئے اس بات سے قوی مانع ہے کہ ہم کمپنی کو شرکت عنان کہیں اور اس کے بعد پھر یہی صورت رہ جاتی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ کمپنی کے ڈائریکٹرز اجرت پر کاروبار کرنے کے لئے روپیہ اکٹھا کرتے ہیں (جس سے شرکت املاک وجود میں آئی) تاکہ وہ خود بھی اجرت پر کام کریں اور دوسرے سے بھی اجرت پر اس مال میں کاروبار کروائیں۔

اس پر مولانا عثمانی مدظلہ کی جانب سے یہ کہا جائے کہ ڈائریکٹر جب کارپوریٹ لا اتھارٹی سے اجازت حاصل کر لیتے ہیں تو اس وقت کمپنی اپنے شخص قانونی کی صورت میں وجود میں آ جاتی ہے جو ڈائریکٹروں کے وجود سے علیحدہ وجود رکھتی ہے لہٰذا اب کمپنی اپنے ڈائریکٹرز میں سے کسی کو ایگزیکٹو ڈائریکٹر بناتی ہے یا چیف ایگزیکٹو بناتی ہے تو گویا کسی غیر کو بناتی ہے اور کمپنی کے ڈائریکٹرز میٹنگ فیس لیتے ہیں تو شرکت عنان کے شریک کی حیثیت سے نہیں بلکہ کمپنی کے شخص قانونی کے اجیر کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ اس لئے شرکت عنان کے شریک کا اجرت پر کام کرنا مفقود ہے۔

اس کا جواب ہم اپنی کتاب جدید معاشی مسائل کے صفحہ 33,34 پر دے چکے تھے

لیکن مولانا عثمانی مدظلہ نے اس کی طرف التفات ہی نہیں کیا۔ اس کو ہم یہاں دوبارہ نقل کرتے ہیں:

''مولانا عثمانی مدظلہ کے بتائے ہوئے وقف و بیت المال کے نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم شریعت کی رو سے شخص قانونی کے وجود وعدم وجود کا مدار بتاتے ہیں۔

وقف (مدرسہ ہو یا کچھ اور) اور بیت المال کے ساتھ کچھ حقوق اور ذمہ داریاں وابستہ ہوتی ہیں لیکن وہ محض معنوی یا بے جان ہونے کی وجہ سے نہ اپنے حقوق کی تحصیل کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے لئے ایک متولی یا نگران مقرر کیا جاتا ہے جو ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور ان کی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ ان اداروں کے اثاثہ جات سے چونکہ اس متولی کا کوئی مالکانہ تعلق نہیں ہوتا اس لئے حقوق و ذمہ داریوں کو اس سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے مجبوراً ادارہ ہی کی طرف ان کو منسوب کیا جاتا ہے اور اس لئے ادارہ کو معنوی شخص یا قانونی شخص کہا جاتا ہے۔

اور جہاں کوئی ادارہ ایسا ہو کہ اس کے متولی و منتظم کی سرمایہ کاری اور اس کے مفادات اس ادارے سے وابستہ ہوں اور اس کے تصرفات کا فائدہ بالواسطہ یا بلاواسطہ خود اسی کو ہو تو حقوق و ذمہ داریاں خود اسی کے ساتھ وابستہ ہوں گی۔ اس صورت میں ایسی کوئی مجبوری نہیں کہ ہم ان حقیقی اشخاص کو نظر انداز کر کے ادارے کی فرضی شخصیت کا اعتبار کریں اور حقوق و ذمہ داریوں کو اس کے ساتھ وابستہ کریں۔ لہٰذا حقوق و ذمہ داریوں کی نسبت لامحالہ حقیقی شخص کی طرف ہو گی۔ (البتہ محض سہولت کی خاطر ہم بول چال میں اور لکھت پڑھت میں مجازاً کمپنی کی طرف نسبت کر سکتے ہیں)۔

باب:7

محدود ذمہ داری کی خرابی

کتاب ''مروجہ اسلامی بینکاری'' میں محدود ذمہ داری کو شرط فاسد کہے جانے پر تنقید کرتے ہوئے مولانا عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

''دوسرے حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم نے کئی مواقع پر یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ کمپنی میں چونکہ عقد اجارہ ہوتا ہے اور اجارہ شرط فاسد سے فاسد ہو جاتا ہے، اس لئے یہ فاسد شرط کمپنی کے ساتھ حصہ داران کے کئے ہوئے عقد کو بھی فاسد کر دے گی۔ مولانا (عبدالواحد) فرماتے ہیں:

''پھر وہ عقد (یعنی کمپنی) شرکت عنان نہیں، اجارہ ہے جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں۔ تو دارالعلوم والوں کا یہ کہہ کر مطمئن ہو جانا کہ شرکت شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتی بیکار محض ہے۔''

......اگر اسے (یعنی کمپنی کو) عقد اجارہ بھی مان لیا جائے تو جو شرط کسی عقد کو فاسد کرتی ہے وہ شرط ہوتی ہے جو متعاقدین میں سے کوئی دوسرے پر لگائے۔ لیکن اگر عقد میں کوئی شرط کسی تیسرے اجنبی شخص کے ذمے لگائی جائے تو عقد فاسد نہیں ہوتا بلکہ شرط خود فاسد ہو جاتی ہے علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

المراد بالنفع ما شرط من احد العاقدین علی الآخر فلو علی اجنبی لا یفسد و یبطل الشرط...... (رد المحتار باب بیع الفاسد

ج 5 ص 85).

...... یہاں محدود ذمہ داری کا شرکاء کے باہمی حقوق وفرائض سے کوئی تعلق نہیں، یعنی یہ شرط ایک شریک دوسرے شریک پر یا (اگر مفتی عبدالواحد صاحب کے بقول یہ اجارہ ہے تو) مستاجر اجیر پر نہیں لگا رہا، بلکہ یہ تمام حصہ داروں کی طرف سے اپنے دائنین کے لئے ایک اعلان یا ان کے ساتھ ایک شرط ہے کہ اگر کمپنی دیوالیہ ہونے کی صورت میں آپ کے دیون کمپنی کے اثاثوں سے زیادہ ہوئے تو آپ صرف اثاثوں کی حد تک ہی اپنے دیون وصول کرسکیں گے۔ اس اعلان کے مخاطب شرکاء نہیں بلکہ شرکاء کے دائنین ہیں، لہٰذا یہ شرط متعاقدین ایک دوسرے پر نہیں لگا رہے بلکہ اجنبی پر لگا رہے ہیں، اور ایسی شرط مذکورہ بالا عبارات فقہیہ کی روشنی میں خود تو باطل ہوجاتی ہے لیکن اس سے عقد فاسد نہیں ہوتا۔ محدود ذمہ داری کے ناجائز ہونے کی صورت میں یہ اعلان اور اجنبیوں پر یہ شرط عائد کرنا ناجائز ہوگا، اور شرط بھی فاسد ہوگی لیکن اس کی وجہ سے عقد کو فاسد نہیں کہا جاسکتا۔ (غیر سودی بینکاری ص345,346)

ہم کہتے ہیں

i- مذکورہ بالا بحث میں مولانا مدظلہ نے ہمارا نام بلاوجہ ہی داخل کیا ہے۔ ہماری عبارت تو فقط یہ تھی:

''اس شرط سے شیئرز خریدنا کہ شیئرز کی مالیت کی مقدار سے زیادہ نقصان کی صورت میں وہ زائد نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا، ناجائز ہے کیونکہ جب ڈائریکٹران اس کی طرف سے بھی کاروبار کرتے ہیں تو اس کے حصہ میں ہونے والے پورے نقصان کا وہ ذمہ دار ہے اور محدود ذمہ داری کے غیر شرعی قانون کے ذریعہ سے وہ بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔

(جدید معاشی مسائل ص 61)

مولانا عثمانی مدظلہ نے ہماری جو عبارت نقل کی ہے اس کا تعلق ہم نے ایک دوسری شرط کے ساتھ جوڑا تھا۔ اس سے متعلق مولانا مدظلہ نے کچھ ذکر نہیں کیا۔ اپنا وہ مضمون ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

کمپنی کے ڈائریکٹران کا سودی لین دین کرنا

وہ کمپنیاں جو سودی لین دین میں ملوث ہوں اور الا ماشاءاللہ تقریباً سب ہی اس میں ملوث ہیں شیئرز خریدکران میں حصہ دار بننے کے جواز میں مذکورہ بالا مانع کے علاوہ ایک اور مانع بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ عقد اجارہ جو کہ کمپنی کے ڈائریکٹران اور شیئرز ہولڈر کے درمیان طے پاتا ہے اس میں ایک شرط فاسد بھی ہے جو یہ ہے کہ کمپنی کے ڈائریکٹران کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ کمپنی کے Behalf پر قرضہ لے سکتے ہیں اور اس پر سود کی ادائیگی کر سکتے ہیں۔ یہ بات چونکہ ڈائریکٹران کے اختیارات کے بیان میں اور کمپنی کے میمورنڈم آف ایسوسی ایشن Memorandum of association میں مذکور ہوتی ہے لہٰذا جب کوئی شخص کمپنی کے شیئرز ابتدا میں یا درمیان میں خریدتا ہے تو وہ اس شرط کو تسلیم کرتے ہوئے خریدتا ہے اور چونکہ یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے لہٰذا فاسد ہے جس سے عقد اجارہ فاسد ہوا۔

ایک کمپنی کے ڈائریکٹران کے بیان میں اس طرح درج ہے:

The directors are empowered by the company`s articles of association to borrow or raise money or secure payment of any sum or sums of money for the purpose of the company's business.....

(ترجمہ: کمپنی کے آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن کے تحت ڈائریکٹران کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کمپنی کے کاروبار کی خاطر کسی بھی مقدار میں قرضہ لے سکتے ہیں یا رقم اکٹھی کر سکتے ہیں۔)

اس طرح ایک کمپنی کے میمورنڈم میں یوں درج ہے:

To borrow money from time to time required for any of the purpose of the company by receiving advances or any sum or sums of money with or without security upon such terms as the directors may deem expedient..........

To issue or guarantee the issue of or the payment of interest on the shares, debentures, debenturestock or other security or obligation of this company......

(ترجمہ: کمپنی کے ڈائریکٹران کو اختیار ہوگا کہ کمپنی کے مفاد کی خاطر وقتاً فوقتاً ضرورت کے بقدر رقم قرض لے سکتے ہیں۔ اس کے لئے وہ پیشگی رقوم بھی لے سکتے ہیں اور ضمانت کے ساتھ یا بلا ضمانت ان شرائط پر بھی قرض لے سکتے ہیں جو وہ مناسب سمجھیں...... وہ حصص پر، ڈبینچرز پر، ڈبینچر سٹاک پر یا امانت پر یا کمپنی کی کسی اور واجب الادا رقم پر سود دے سکتے ہیں۔)

اس شرط فاسد کا بیان یہ ہے کہ ڈائریکٹران جب کوئی قرض لیتے ہیں تو وہ اپنے نام پر نہیں لیتے، بلکہ کمپنی کے نام پر لیتے ہیں اور اس کی واپسی اور سود کی ادائیگی کی ذمہ دار کمپنی ہوتی ہے، لہٰذا وہ قرض کمپنی میں سرمایہ کاری کرنے والے تمام افراد (یعنی ڈائریکٹران اور شیئرز ہولڈرز وغیرہ) پر ان کے سرمایہ کے تناسب سے تقسیم ہو جاتا ہے۔ اب ہر سرمایہ کار اپنے اپنے سرمایہ (یا عدد حصص) کے بقدر قرضہ کی واپسی اور اس پر سود کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگر کمپنی کو نقصان ہو تو قرضہ کی واپسی اور سود کی ادائیگی شیئر ہولڈرز کے اصل سرمایہ میں سے کی جاتی ہے۔ اور اگر کمپنی کو نفع ہو تو شیئر ہولڈر کو ہونے والے نفع سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے۔

یہ تو قرضہ لینے کی صورت میں ہے۔ ایک اور وہ صورت ہے جب کمپنی اپنا فاضل سرمایہ کسی بینک میں رکھ کر سود حاصل کرے اور اس سود کو نفع میں شامل کر کے شیئر ہولڈرز میں تقسیم کرے۔

اگرچہ مولانا تقی عثمانی مدظلہ یہ لکھ چکے ہیں کہ:

''شاید ہی کوئی کمپنی ایسی ہو گی جو کسی نہ کسی طرح سودی کاروبار میں ملوث نہ ہو۔ یہ کمپنیاں دو طریقے سے سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ یہ کمپنیاں فنڈ بڑھانے کے لئے بینک سے سود پر قرض لیتی ہیں اور اس قرض سے اپنا کام چلاتی ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کے پاس جو زائد اور فاضل رقم ہوتی ہے وہ سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی ہے اور اس پر وہ بینک سے سود حاصل کرتی ہے، وہ سود بھی ان کی آمدنی کا ایک حصہ ہوتا ہے''۔ (شیئرز کی خرید و فروخت ص 17)

اور ہم مان لیتے ہیں کہ اب کچھ ایسی کمپنیاں وجود میں آ گئی ہوں گی کہ جو سودی کاروبار میں ملوث نہ ہوں لیکن بہرحال وہ پھر بھی اقل قلیل ہیں۔

شیئرز کی خرید و فروخت کے جواز میں دار العلوم کے فتوے کی وکالت

لیکن دار العلوم کے فتوے کی جاندار وکالت دیکھئے۔ لکھتا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ ہر کمپنی کے نظام میں قرضے لینے کا ذکر اور اس کی شرط نہیں ہوتی۔ پھر جن کمپنیوں کے نظام میں قرضے لینے کا ذکر ہوتا ہے ان سب میں قرضے کے ساتھ ''سود'' کا لفظ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان دو صورتوں میں تو سرے سے کوئی شرط نہیں ہے۔ ہاں بعض کمپنیوں میں سود کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگرچہ شرط فاسد پائی جاتی ہے مگر یہ شرط عقد مشارکہ کے اندر ہے کیونکہ جیسا کہ اوپر بتایا گیا کمپنی کی اصل عقد مشارکہ ہے اور عقد مشارکہ ان عقود میں سے ہے جو شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتے بلکہ خود وہ شرط باطل شمار

ہوتی ہے۔

فی البحر الرائق (296/5) نقلاً عن الفتاوی الصغری. ذکر خواھر زادہ فی اول المضاربة الشرکات لاتبطل بالشروط الفاسدة“

کوئی دارالعلوم کے ان حضرات سے پوچھے کہ کمپنی کے نظام میں اگر قرض لینے کا ذکر اور اس کی شرط نہیں ہوتی تو کیا وہ کمپنی قرض کے بغیر ہی کام چلاتی ہے۔ اگر اس کا قرض لینا معروف ہے یا معلوم ہے کہ قرض کے بغیر کوئی کمپنی نہیں چلتی تو **المعروف کالمشروط** کا قاعدہ تو قائم ہے۔ اسی طرح جب قرض لینے کا ذکر ہو لیکن اس کے ساتھ سود کا ذکر نہ ہو تو **المعروف کالمشروط** کا قاعدہ ختم نہیں ہو جاتا۔

پھر وہ عقد شرکت عنان نہیں اجارہ ہے جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں تو دارالعلوم والوں کا یہ کہہ کر مطمئن ہو جانا کہ شرکت شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتی بے کار محض ہے۔

(جدید معاشی مسائل ص 63 تا 67)

باب:8

تکافل (اسلامی انشورنس) کا نظام غیر اسلامی ہے

مروجہ تکافل کا نظام مولانا عثمانی مدظلہ کے ذکر کردہ وقف کے ان چار قواعد پر مبنی ہے

1- نقدی (روپے) کا وقف درست ہے۔

2- واقف اپنے کئے ہوئے وقف سے خود نفع اٹھا سکتا ہے (اپنی اولاد کو نفع دے سکتا ہےاور دیگر غنی لوگوں کے انتفاع کی شرط کر سکتا ہے)۔

3- وقف کو جو تبرع یعنی چندہ کیا جائے وہ وقف کی ملکیت بنتا ہے خود وقف نہیں بنتا۔

4- وقف کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ (اغنیاء کے انتفاع کے بعد) بالآخر خیر کی کسی ایسی مد کے لیے ہو جو کبھی ختم نہ ہونے والی ہو مثلاً فقراء کے لیے ہو۔

ان قواعد پر مبنی تکافل کے نظام کا حاصل یہ ہے

تکافل (یعنی اسلامی انشورنس) کمپنی اپنے کچھ سرمایہ سے ایک وقف فنڈ قائم کرتی ہے۔اس فنڈ کی شرائط میں سے ہے کہ اولا وقف فنڈ کے جن ممبران کا کسی حادثہ میں نقصان ہو جائے اس فنڈ کے منافع میں سے ان کے نقصان کی تلافی کی جائے گی اور بالآخر وہ نیکی کے کاموں کے لیے مثلاً فقراء کے لیے ہوگا۔

وقف فنڈ کا ممبر بننے کے لیےاس میں ایک خاص چندہ دینا ہوگا جو ہر نوع کی انشورنس

کے مطابق ہوگا۔

یہ وقف فنڈ خود ایک معنوی شخصیت رکھتا ہے جس کی بنیاد پر وہ مالک بنتا بھی ہے اور بناتا بھی ہے۔ لہٰذا انشورنس پالیسی لینے والے اس کو جو چندہ دیتے ہیں وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔

پالیسی لینے والوں کو نقصان کی تلافی میں بیمہ کی جو رقم ملتی ہے وہ ان کے چندے کا عوض نہیں ہوتی بلکہ وقف فنڈ کی شرائط کے مطابق اس کے حقدار بننے کی وجہ سے ملتی ہے۔

خود تکافل کمپنی دو طرح سے کام کرتی ہے:

i- وہ وقف کے متولی کی طرح وقف فنڈ کا انتظام کرتی ہے یعنی انشورنس پالیسی لینے والوں سے چندے وصول کرتی ہے، حقداروں کے نقصان کا تدارک کرتی ہے اور فنڈ کے علیحدہ سے حسابات رکھتی ہے۔ ان خدمات پر تکافل کمپنی اجرت لیتی ہے۔

ii- وقف فنڈ کی وقف شدہ اور مملوکہ (چندے کی) رقموں پر وکیل بالاجرت یا مضارب بن کر کام کرتی ہے اور اپنے حصہ کا نفع یا اجرت لیتی ہے۔

تکافل کے نظام کی بنیادیں

مذکورہ بالا تفصیل سے تکافل کے نظام کی جو بنیادیں سامنے آئیں وہ یہ ہیں:

1- منقولہ اشیاء مثلاً نقدی کا وقف صرف اپنی ذات پر یا دیگر اغنیاء پر جائز ہے جب کہ بالآخر وجوہ خیر کے لیے ہو۔

2- وقف کو چندہ دینا ایک مستقل معاملہ ہے اور وقف کے قواعد کے مطابق چندہ دینے والے کا نقصان کی تلافی کا حقدار ٹھہرنا بالکل دوسرا معاملہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا عوض نہیں۔

3- وقف فنڈ اور تکافل کمپنی دونوں ہی شخص قانونی ہیں اور کمپنی کے ڈائریکٹرز کمپنی سے غیر شخصیتیں ہیں۔

تکافل کے نظام کی یہ تینوں بنیادیں باطل ہیں

اس دعوے کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

پہلی باطل بنیاد: منقولہ اشیاء کا وقف اوّلاً صرف اپنی ذات پر یا اپنی اولاد پر یا دیگر اغنیاء پر

اس کے باطل ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ ابن ہمام رحمہ اللہ اونٹوں کو اور گھوڑوں کو فی سبیل اللہ وقف کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

ثم اذا عرف جواز وقف الفرس والجمل فی سبیل الله.

فلو وقفه علی ان یمسکه ما دام حیا ان امسکه للجهاد جازله ذلک لانه لولم یشترط کان له ذلک لان لجاعل فرس السبیل ان یجاهد علیه و ان اراد ان ینتفع به فی غیر ذلک لم یکن له ذلک وصح جعله للسبیل یعنی یبطل الشرط ویصح وقفه. (فتح القدیر ص 219 ج 6).

(ترجمہ: پھر جب گھوڑے اور اونٹ کو فی سبیل اللہ وقف کرنے کا جواز معلوم ہوا تو اگر کسی نے اس شرط کے ساتھ گھوڑے کو وقف کیا کہ وہ اپنی زندگی بھر اس کو اپنے پاس رکھے گا تو اس میں دو صورتیں ہیں۔

i- اگر اس پر خود جہاد کرنے کے لیے اس کو اپنے پاس رکھا تو یہ اس کے لیے جائز ہے کیونکہ اگر وہ یہ شرط نہ بھی کرے تب بھی اس کو حق حاصل ہے کہ خود اس پر جہاد کرے۔

ii- اور اگر وقف کرنے والے کی مراد یہ ہے کہ وہ گھوڑے کو اپنے دیگر ذاتی کاموں میں استعمال کرے گا تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہے اور اس کا وقف تو صحیح ہو گا لیکن شرط باطل اور کالعدم ہو گی)۔

<u>اس حوالہ سے</u> بخوبی واضح ہے کہ منقولہ اشیاء مثلاً نقدی اور گھوڑے وغیرہ میں اگر وقف اس طرح کیا کہ اول تو صرف وہ خود یا اس کی اولاد یا دیگر اغنیاء اس سے فائدہ اٹھائیں گے پھر بالآخر وہ فقراء میں یا کسی اور نیک کام میں وقف ہو تو یہ صورت جائز نہیں۔ ہاں اگر وجوہ خیر میں فوری وقف کر دے اور ایک حقدار بن کر کوئی غنی بھی فائدہ اٹھائے تو جائز ہے مثلاً نقدی وقف کی کہ اس کے منافع سے مدرسہ کے طلبہ کے لیے ٹھنڈے پانی کا بندوبست کیا

جائے تو فقراء کی طرح اغنیاء کے بچے بھی اس سے نفع اٹھا سکتے ہیں اور اگر یوں کہا کہ پہلے دس سال صرف اغنیاء کے بچوں کے لیے وقف ہے پھر فقراء کے بچوں کے لیے تو یہ جائز نہیں۔

ہماری بات کے برعکس نظام تکافل میں مولانا تقی عثمانی مدظلہ اس بات کو جائز کہتے ہیں کہ تکافل کمپنی کے ڈائریکٹر اور سرمایہ کار اپنا سرمایہ اس طرح سے وقف کریں کہ وہ پہلے تو ایک طویل عرصہ کے لیے محض اغنیاء کے لیے وقف ہو پھر بعد میں کبھی فقراء کے لیے ہو اور اس پر وہ یہ دلیل دیتے ہیں۔

فی الذخیرۃ اذا وقف ارضا او شیئا آخر و شرط الکل لنفسہ او شرط البعض لنفسہ ما دام حیا و بعدہ للفقراء قال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ الوقف صحیح و مشائخ بلخ رحمہ اللہ اخذوا بقول ابی یوسف و علیہ الفتوی ترغیبا للناس فی الوقف...... ولو قال ارضی ھذہ صدقۃ موقوفۃ تجری غلتھا علی ما عشت ثم بعدی علی ولدی و ولد ولدی و نسلھم ابدا ما تناسلوا فان انقرضوا فھی علی المساکین جاز ذلک کذا فی خزانۃ المفتین.

(ترجمہ: ذخیرہ میں ہے جب کوئی شخص کوئی زمین یا کوئی اور (غیر منقولہ) شے وقف کرے اور یہ شرط کرے کہ جب تک وہ زندہ ہے وہ کل وقف کو یا اس کے ایک حصہ کو اپنے استعمال میں رکھے گا تو ابو یوسف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وقف صحیح ہے اور مشائخ بلخ نے ابو یوسف رحمہ اللہ علیہ کے قول کو اختیار کیا اور اسی پر فتوی ہے تا کہ لوگوں کو وقف کرنے میں رغبت رہے......اور اگر کوئی شخص یوں کہے کہ میری یہ زمین صدقہ وقف ہے اور جب تک میں زندہ ہوں میں اس کی آمدنی لوں گا اور میرے بعد میری اولاد اور اولاد کی اولاد نسل چلنے تک لے گی۔ پھر جب میری نسل ختم ہو جائے تو وہ مساکین پر وقف ہو گی تو جائز ہے۔ خزانۃ المفتین میں ایسے ہی مذکور ہے)۔

ہم کہتے ہیں

مولانا عثمانی مدظلہ نے دعوی کیا ہے نقدی جیسی منقولہ شے کو اولا اغنیاء پر اور بالآخر فقراء پر وقف کرنے کا لیکن دلیل دی ہے غیر منقولہ شے یعنی زمین وعمارت کو اس طرح وقف کرنے کی حالانکہ دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ کہ غیر منقولہ جائیداد خود ابدی ودائمی ہوتی ہے جب کہ منقولہ اشیاء میں ابدیت ودوام کی توقع ہی نہیں ہوتی بلکہ نقدی میں تو خطرہ ہوتا ہے کہ کاروبار میں نقصان کے باعث اصل رقم کل یا کچھ جاتی رہے جب کہ دیگر منقولہ اشیاء مثلاً بہت سے برتن، کتابیں اور مصاحف وغیرہ تیس چالیس سال کے استعمال سے بوسیدہ ہو جاتے ہیں اور کسی دوسرے کے کام کے نہیں رہتے۔ علاوہ ازیں وہ کسی حادثہ کا شکار بھی ہو سکتی ہیں اور چوری بھی ہوسکتی ہیں۔ اس لیے نقدی سمیت منقولہ اشیاء میں صرف یہی صورت ممکن ہے کہ آدمی ان کو وجوہ خیر میں اولا ہی وقف کر دے اور شرط کر دے کہ دیگر حقداروں کے ساتھ وہ خود بھی نفع اٹھائے گا یا وقف کے منافع کے حقدار ہونے کی وجہ سے دوسرے حقداروں کے ساتھ شریک ہوگا۔

مولانا عثمانی مدظلہ کے دارالعلوم کے جناب مفتی عصمت اللہ اور جناب ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی نے ہماری بات پر یہ اعتراض کیا:

> ''شروع میں شیئر ہولڈرز نے کچھ رقم وقف کر کے ایک فنڈ قائم کیا، اس مرحلہ پر یہ وقف الدراھم یا وقف النقود ہے اور صرف یہی وقف ہے۔ اس میں واقفین نہ وقف علی النفس کی کوئی شرط لگاتے ہیں اور نہ ہی انتفاع کی کوئی شرط لگاتے ہیں بلکہ وہ وقف کر کے اس فنڈ کے انتفاع سے فارغ ہو گئے......
> جہاں تک چندہ کا تعلق ہے تو وہ وقف ہے ہی نہیں بلکہ وہ مملوک وقف ہے جس میں وقف علی النفس کی بحث نہیں آتی کیونکہ یہ وقف ہی نہیں۔'' (تحریر نمبر 1 ص 2)

''آپ نے وقف النقود میں علی الاغنیاء المتضررین کو بھی ناجائز قرار دیا

لیکن اس کی کوئی دلیل ہمیں نہیں ملی جب کہ اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی‘‘۔(تحریر نمبر 2 ص 1)

’’نیز یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ تکافلی نظام میں وقف کی شرائط میں اغنیاء کی کوئی قید مذکور نہیں بلکہ متضرر کوئی بھی ہوسکتا ہے خواہ وہ غنی ہو یا فقیر ہو۔‘‘

ہم کہتے ہیں

ان دو حضرات نے یہاں ہم پر تین اعتراض کئے ہیں۔ ہم ایک ایک کو ذکر کر کے اس کا جواب دیتے ہیں:

پہلا اعتراض

ہم نے جو وقف علی النفس کا تذکرہ کیا ہے وہ بے جا کیا کیونکہ تکافل کے نظام میں وقف علی النفس (اپنی ذات پر وقف) کی شرط ہوتی ہی نہیں۔

جواب

یہ تو ہم نے بھی کہیں نہیں لکھا کہ تکافل کے نظام میں وقف علی النفس کی شرط ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم نے نقدی اور دیگر منقولہ اشیاء میں جو وقف علی النفس کا ذکر کیا اس کی دو وجہیں ہیں:

(i) تکافل کے نظام میں وقف فنڈ اولاً انشورنس پالیسی لینے والوں کے لیے ہوتا ہے جو عام طور سے مالدار ہوتے ہیں اور بالآخر فقراء کے لیے ہوتا ہے۔ پھر اپنی ذات پر وقف ہو یا دوسرے مالداروں پر دونوں میں جو اصل مطلوب ہے یعنی فقراء پر وقف وہ مؤخر ہے اس لیے دونوں کا شرعی حکم اور شرعی حیثیت یکساں ہے کہ ناجائز ہے۔ تو وقف علی النفس کے عدم جواز کو ذکر کرنے سے وقف علی الاغنیاء کے عدم جواز کا حکم بھی سامنے آ گیا۔

(ii) باوجودیکہ تکافل کے نظام میں وقف علی النفس کی شرط نہیں ہے صرف نقصان کا شکار ہونے والے ممبران کا ذکر ہے لیکن مولانا عثمانی مدظلہ نے وقف کی اساس پر تکافل کا جو

تفصیلی نظام دیا ہے اور اس میں اس کے جو چار قواعد ذکر کئے ان میں سے ایک وقف علی النفس کے جواز کو ذکر کیا ہے اور اس کے جواز سے انہوں نے نقصان کا شکار ہونے والے اغنیاء کے لیے وقف کو جائز کہا۔ اسی کی مناسبت سے ہم نے نقدی و دیگر منقولہ اشیاء میں وقف علی النفس کے عدم جواز کو ثابت کیا اور اس کے عدم جواز سے اغنیاء پر وقف کو بھی ناجائز کہا۔

دوسرا اعتراض

ہم نے نقصان کا شکار ہونے والے مالدار ممبران (اغنیاء متضررین) پر وقف کو ناجائز کہا حالانکہ اس کی کوئی دلیل ان دو حضرات کو نہیں ملی۔

جواب

جب وقف علی النفس اور وقف علی الاغنیاء کی شرعی حیثیت اور شرعی حکم یکساں ہے اور نقدی و دیگر منقولہ اشیاء میں وقف علی النفس کے عدم جواز کی دلیل ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں تو جو ایک کی دلیل ہے وہی دوسرے کی بھی دلیل ہے۔

تیسرا اعتراض

تکافل کے نظام میں وقف کی شرائط میں نقصان کا شکار ہونے والوں کے لیے مالدار ہونے کی شرط مذکور نہیں وہ فقیر بھی ہوسکتا ہے۔

جواب

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تکافلی نظام میں وقف کی شرائط میں اغنیاء کی کوئی قید مذکور نہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ واقع میں انشورنس پالیسی لینے والا بھی کوئی فقیر نہیں ہوتا، ضرور غنی ہی ہوتا ہے۔ مثلاً نئی کار خرید کر اس کی انشورنس کرانے والا فقیر نہیں ہوتا۔

دوسری باطل بنیاد: چندہ اور نقصان کی مالی تلافی ایک دوسرے کا عوض نہیں

اپنی کتاب جدید معاشی مسائل میں ہم نے تفصیل سے اس بحث کو ذکر کیا ہے اور ثابت کیا کہ وقف فنڈ کے ساتھ انشورنس پالیسی لینے والے کا معاملہ اور عقد بہرحال معاوضہ کا ہے۔ مختصر دلیل یہ ہے:

1- عقود میں اعتبار معانی کا ہوتا ہے الفاظ کا نہیں اور زیر بحث معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ:

وقف شخص قانونی ہے اور وہ پالیسی ہولڈر سے کہتا ہے کہ تم مجھے چندہ دو گے تو حادثے کی صورت میں میں تمہیں تلافی کی رقم دوں گا اور تھوڑا چندہ دو گے تو تھوڑی تلافی کروں گا زیادہ دو گے تو زیادہ کروں گا۔ (جدید معاشی مسائل ص 117,116)۔

لیکن جناب مفتی عصمت اللہ اور جناب ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی نے اگرچہ ہماری بات کے خلاف کوئی دلیل بھی نہیں دی لیکن اپنی بات پر اصرار جاری رکھتے ہوئے لکھا:

> ''یہاں دونوں اپنی نوعیت کے اعتبار سے الگ الگ معاملات ہیں کیونکہ چندہ دہندگان کو نقصان کی تلافی کا فائدہ اس کی کسی شرط کی وجہ سے نہیں مل رہا بلکہ وہ تو فنڈ کو چندہ دے کر فنڈ کا رکن بن گیا، اب اس کو یہ فائدہ واقفین کی شرط کی وجہ سے منجملہ موقوف علیہم میں شامل ہونے پر مل رہا ہے جو کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے عطاء مستقل ہے۔ اور واقفین کو اس بات کا اختیار ہے کہ وقف میں یہ شرط لگائیں کہ اس وقف کے موقوف علیہم وہ لوگ ہوں گے جو اس فنڈ کے رکن ہوں گے۔ چونکہ یہ شرط لگانا کسی شرعی اصول سے متصادم نہیں اس لئے اسے ناجائز کہنے کی کوئی وجہ یا دلیل موجود نہیں جیسا کہ عام طور پر مختلف برادریوں میں اس طرح فنڈز بنائے جاتے ہیں، لہٰذا اس کو عقد معاوضہ کہنا درست نہیں، عقد معاوضہ اس وقت ہوتا کہ چندہ کمپنی مالکان کو دیا جاتا، کمپنی مالکان اس چندہ کے مالک بنتے اور پھر کمپنی مالکان نقصان کی تلافی کرتے'' (تحریر نمبر 1 ص 4)

ہم کہتے ہیں

1- جہاں تک برادریوں کے فنڈ اور تکافل فنڈ کے درمیان فرق کا تعلق ہے تو وہ بہت سے ہیں۔

i- عام طور پر برادریوں کے فنڈ سے استفادہ مالداروں کے لیے نہیں ہوتا بلکہ غریبوں کے لیے یا جو کسی حادثہ میں غربت کے درجہ میں آجائیں ان کے لیے ہوتا ہے۔

ii- امداد باہمی فنڈ میں یہ نہیں ہوتا کہ جو جتنا زیادہ چندہ دے گا اس کو تدارک اتنا زیادہ ملے گا بلکہ ہر ایک کی ضرورت کے بقدر یا ہر ایک کو مخصوص رقم ملتی ہے اگرچہ واقع میں وہ چندہ کم ہی دیتا ہے۔

iii- تکافل میں فنڈ پہلے سے قائم ہوتا ہے جس کے ساتھ کمپنی کے شرکاء کا مفاد وابستہ ہے کیونکہ وہ مضارب بن کر یا وکیل بن کر روپیہ کماتے ہیں۔ اس کے برعکس امداد باہمی فنڈ کے متولی بھی چندے کو کسی دوسرے کو مضاربت پر دیتے ہیں لیکن خود کوئی کمائی نہیں کرتے۔

iv- امداد باہمی میں ارکان اکٹھے ہو کر ہر ایک کے فائدے کا سوچتے ہیں جب کہ تکافل میں وقف فنڈ کا رکن صرف اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ جو بھی تکافل کمپنی میں جاتا ہے اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ دوسروں کو کیا مل رہا ہے۔

اگر اغنیاء و مالدار محض اپنی فائدے کے لیے تکافل کے طرز پر امداد باہمی کا فنڈ قائم کریں اور تکافل کے طرز پر ہی اس کو چلائیں تو یقیناً وہ بھی درست نہ ہوگا۔

2- ان حضرات کا یہ کہنا کہ ''عقد معاوضہ اس وقت ہوتا کہ چندہ کمپنی مالکان کو دیا جاتا کمپنی مالکان اس چندہ کے مالک بنتے اور پھر کمپنی مالکان نقصان کی تلافی کرتے''، اگر یہ حضرات کچھ توجہ فرماتے تو اس کا جواب ہماری اوپر نقل کردہ دلیل میں موجود تھا۔ پھر بھی ہم جواب کو مزید واضح کرتے ہیں۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

ان الوقف له شخصية معنوية يتمكن بها من ان يتملك

الاموال و یستثمرها و یملکها.

(ترجمہ: وقف فنڈ کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔ اس کی خود اپنی معنوی شخصیت ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ مالک بنتا ہے اور مالک بناتا ہے)۔

ہم کہتے ہیں

مفتی عصمت اللہ صاحب اور مولانا اعجاز احمد صمدانی صاحب کے بقول اگر چندہ کمپنی مالکان کو دیا جاتا اور وہ اس کے مالک بنتے اور پھر وہ نقصان کی تلافی کرتے تو یہ عقد معاوضہ بنتا۔ یہ حضرات شخص قانونی میں مالک بننے اور بنانے اور ذمہ دار بننے اور بنانے کی صلاحیت مانتے ہیں۔ پھر جب چندہ دہندگان وقف فنڈ کو چندہ دیتے ہیں اور وقف فنڈ اس کا مالک بن جاتا ہے اور وقف فنڈ چندے ہی کی بنیاد پر نقصان کی تلافی کرتا ہے (کیونکہ وقف فنڈ کی شرط یہ ہے کہ جو اس کو چندہ دے گا وہ اسی کے نقصان کی تلافی کرے گا) تو یہ بھی عقد معاوضہ ہوا اور دونوں کی حقیقت تو ایک ہوئی۔ جب ایک جگہ عقد معاوضہ ہے تو دوسری جگہ بھی عقد معاوضہ ہوگا۔

اور عقد معاوضہ ہوتے ہوئے تلافی کمی بیشی کے ساتھ ہو تو سود بن جاتا ہے اور تلافی کے غیر یقینی ہونے کی وجہ سے قمار (جوا) بن جاتا ہے۔ اور بعینہ یہی خرابیاں غیر اسلامی انشورنس میں ہیں۔

تیسری باطل بنیاد: تکافل کمپنی کا خود ہی رب المال ہونا اور خود ہی مضارب ہونا

1- چونکہ ایک ہی شخص رب المال بھی ہو اور مضارب بھی ہو یہ جائز نہیں اس لیے ہم نے اس باطل بنیاد کی نشاندہی کی۔ اس پر مفتی عصمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی صاحب جواب میں لکھتے ہیں۔

"جہاں تک اس خیال کا تعلق ہے کہ اس سے کمپنی خود ہی رب المال اور خود ہی مضارب بنتی ہے یہ درست نہیں بلکہ اس صورت میں وقف فنڈ کا پول جو کہ شخص قانونی ہے وہ رب المال ہوتا ہے اور کمپنی مضارب ہوتی ہے"۔

(تحریر 1 ص 6)

ہم کہتے ہیں

ہماری بات غلط نہیں کیونکہ ان حضرات کے بقول وقف فنڈ بھی شخص قانونی ہے اور کمپنی بھی شخص قانونی ہے جس کی طرف اگرچہ حقوق و ذمہ داریوں کی نسبت کی جاسکتی ہے لیکن وہ خود معنوی اور اعتباری ہوتا ہے یعنی گونگا بہرا بلکہ بے جان ہوتا ہے۔ حقوق کے تحفظ اور ذمہ داریوں کی ادائیگی اور معاملات کی تعبیر کے لیے اس کو شخص حقیقی یعنی متولی کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا حقیقت میں تو کمپنی جو کہ خود شخص قانونی ہے دوسرے شخص قانونی یعنی وقف فنڈ کی متولی نہیں بن سکتی۔ ان دونوں کے متولی تو ڈائریکٹرز بن سکتے ہیں جو اشخاص حقیقی ہیں۔ اب وہ ڈائریکٹرز جب ایک شخص قانونی کو رب المال اور دوسرے شخص قانونی کو مضارب بناتے ہیں اور دونوں کے متولی وہ خود ہیں تو درحقیقت وہ خود ہی رب المال بھی بنتے ہیں اور خود ہی مضارب بھی بنتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کے متولی ہونے کی وجہ سے دونوں کے معبّر وہ خود ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ ہم روپیہ مضاربت پر دیتے ہیں اور ہم مضاربت پر لیتے ہیں۔ اور چونکہ کمپنی کے ان ڈائریکٹرز کو عام طور سے کمپنی کہہ دیا جاتا ہے اس لیے ہمارا یہ کہنا درست ہے کہ یہاں کمپنی خود ہی رب المال ہے اور خود ہی مضارب ہے۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ کا خیال ہے کہ:

والظاهر انه لا مانع من كونها متولية للوقف و مضاربة فى اموالها فى وقت واحد...... فان الفقهاء اجازوا لناظر الوقف ان يستاجر ارض الوقف باجرة المثل عند بعضهم و بما يزيد على اجرة المثل عند الآخرين (الفتاوى الهندية ج 2 ص 421) فيمكن ان تقاس عليه المضاربة و ان لم اره فى كلام الفقهاء بصراحة.

(ترجمہ: ظاہر یہ ہے کہ کمپنی ایک ہی وقت میں وقف فنڈ کی متولی بھی ہو اور اس کے اموال میں مضارب بھی ہو اس سے کوئی مانع نہیں ہے...... کیونکہ فقہاء نے وقف کے ناظر

کے لیے جائز بتایا ہے کہ وہ وقف کی زمین کو خود اجرت مثل یا اس سے زائد کے عوض کرایہ پر لے لے۔ اس پر مضاربت کو قیاس کیا جا سکتا ہے اگرچہ اس کی تصریح مجھے فقہاء کے کلام میں نہیں ملی۔)

مولانا عثمانی مدظلہ کی اس بات پر ہم نے لکھا تھا:

''یہ بات غور طلب ہے کہ فقہاء نے ناظر کے لیے وقف کی زمین کو اجرت پر لینے کے جواز کی تصریح کی اور ناظر کے مضارب بننے کے جواز کی تصریح نہیں کی۔ آخر ان دونوں میں کچھ فرق ہوگا تب ہی تو فقہاء نے بظاہر فرق رکھا ہے۔

اور وہ فرق یہ ہے کہ وقف اراضی کو کوئی غصب کر لے تو اگرچہ وہ اجرت پر دینے کے لیے نہ ہو تب بھی غاصب کو اس کی اجرت مثل دینی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ناظر یا متولی وقف کی اراضی کو خود اجرت پر لے لے تو اگرچہ وہ معروف طریقے پر اجارہ نہیں ہے لیکن اجرت مثل واجب ہونے کی وجہ سے اس کو مجازاً اجارہ کہہ دیا۔ مضاربت میں حقیقی یا مجازی کوئی بھی صورت نہیں بنتی اس لیے مضاربت کو اجارہ پر قیاس کرنا ممکن نہیں ہے''۔ (جدید معاشی مسائل ص 129,128)

ہماری اس بات کے جواب میں مفتی عصمت اللہ صاحب اور مولانا اعجاز احمد صمدانی صاحب دو باتیں لکھتے ہیں:

i- ''یہ بات صحیح ہے کہ فقہاء کرام نے متولی وقف کو صرف اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ مال وقف کو اجرت پر دے، مال وقف کو مضاربت پر دینے کی اجازت منقول نہیں لیکن منع بھی تو منقول نہیں۔''

ہم کہتے ہیں

یہی بات تو غور طلب ہے کہ آخر فقہاء نے اجارے کے جواز کی تصریح کیوں کی اور مضاربت کے جواز کی تصریح کیوں نہ کی؟ محض منع منقول نہ ہونا جواز کی دلیل نہیں بن سکتی۔

ii- ”آپ کا یہ کہنا کہ مضاربت کو اجارہ پر قیاس کرنا درست نہیں جس کی وجہ آپ نے یہ بیان فرمائی کہ ”شے مستاجر غصب ہو جائے یا متولی وقف خود اجرت پر لے تو اجرت مثل دینی پڑتی ہے جب کہ مضاربت میں ایسا نہیں ہوتا جس کا حاصل یہ ہے کہ اجرت میں وقف کا نقصان نہیں ہوتا جب کہ مضاربت میں نقصان ہوسکتا ہے۔

یہ فرق اگرچہ قابل لحاظ ہے لیکن مضاربت کی صورت میں نقصان وقف کا احتمال تو اس صورت میں بھی رہتا ہے جہاں مضارب ناظر یا متولی نہ ہو بلکہ کوئی اور شخص ہو حالانکہ اس کو فقہاء کرام نے صراحۃً جائز قرار دیا ہے، نیز اس معاملے کو اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ مضاربت اور اجارہ دونوں آمدنی کے ذرائع ہیں جن سے وقف کا فائدہ ہوتا ہے تو جہاں رقم ڈوبنے کا اندیشہ نہ ہو وہاں وقف کی اشیاء ومملوکات سے نفع حاصل کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے خصوصاً جب کہ وقف یا اس کے مملوکات ایسی چیزیں ہوں کہ انہیں کرایہ پر دینا ممکن نہ ہو جیسے نقد روپیہ تو ایسی صورت میں مضاربت پر مال دینے کی بدرجہ اولی گنجائش ہوگی۔ کما هو مذكور فى الشامية.

قوله و لا من يقبله مضاربة الخ) فى البحر عن جامع الفصولين انما يملك القاضى اقراضه اذا لم يجد ما يشتريه له يكون غلة لليتيم لا لو وجده او وجد من يضارب لانه انفع...... و ما قيل ان مال المضاربة امانة غير مضمون فيكون الاقراض اولى فهو مدفوع بان المضاربة فيها ربح بخلاف القرض. (ج4 ص 487، تحریر 1 ص 5)

ہم کہتے ہیں

اگرچہ ہم نے فرق قدرے مختلف لکھا تھا لیکن یہاں ہم اسی نکتہ کا جواب دیتے ہیں جو ان دو حضرات نے لکھا ہے۔

وقف کا ناظر یا متولی اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ وہ وقف کے حقوق اور منافع کی دیکھ بھال کر سکے۔ اور صحیح دیکھ بھال وہ اس وقت کر سکتا ہے جب وہ دوسرے کو اجارہ یا مضاربت پر دے کیونکہ اس کی وجہ سے مستاجر یا مضارب پر کچھ رکاوٹ ہو گی کہ وہ کسی قسم کا غبن یا دھوکہ نہ کرے اور وقف کو نقصان نہ پہنچائے۔

پھر اجارہ میں تو یہ نظر آیا کہ اس میں اجرت مثل کا معیار موجود ہے۔ لہٰذا اگر ناظر یا متولی وقف کی چیز خود بھی اجارہ پر لے لے تو اس سے اجرت مثل کے ضابطہ پر عمل کرایا جا سکتا ہے۔ مضاربت میں ایسا کوئی ضابطہ اور معیار نہیں ہے۔ یہ مضارب کی دیانت پر ہے کہ وہ صحیح طریقے سے کام کرے یا غلط طریقے سے، نفع دکھائے یا نقصان دکھائے۔ اگر رب المال علیحدہ ہو تو اس کی پوچھ گچھ کے خوف سے کام عام طور سے صحیح ہوتا ہے اور اگر مضارب خود ہی وقف کا متولی اور رب المال ہو تو اس کو کسی کی پوچھ گچھ کا خوف نہ ہو گا اور چونکہ طبائع میں فساد کا غلبہ ہے لہٰذا لوگوں میں خیانت اور دھوکہ غالب ہے۔ ایسے میں اصولی طور پر وقف کے ناظر و متولی کو وقف کے مال میں مضارب بننے کو جائز نہیں کہا جا سکتا۔

شامیہ کے دیئے گئے حوالے سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اس میں ہے کہ قاضی اگر کوئی مضاربت پر کام کرنے والا پائے تو وہ یتیم کا مال اس کو مضاربت پر دے سکتا ہے کیونکہ مضارب کو قاضی کی پوچھ گچھ کا خوف ہو گا۔